جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

۱۹۹۴

مدیر: خرم مراد

اِدارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ
ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۲۰ | نومبر ۱۹۹۴ جمادی الاول ۱۴۱۵ | عدد ۱۱

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور

منصورہ ملتان روڈ لاہور ۵۴۵۷۰ فون نمبر ۷۵۷۰۱۲۴-۸ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور

ماہنامہ ترجمان القرآن، ۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔

فون نمبر۔ سرکولیشن ۷۵۸۷۹۱۶ انتظامی امور، ۷۵۸۵۵۹۰

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔
کراس چیک قبول نہیں کیے جائیں گے

قیمت فی شمارہ ۱۰/- روپے، زر سالانہ ۱۰۰/- روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و بر عظیم ۵۰۰/- روپے، یورپ: ۶۰۰/- روپے، امریکا و آسٹریلیا: ۷۰۰/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

عوامی اصلاح کا کام جماعت اسلامی جیسی دینی تحریک کے لائحہ عمل میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتا ہے۔ اسی کے بل پر پورا لائحہ عمل نافذ ہو سکتا ہے، اور جماعت صحیح سمت میں اور صحیح انداز میں آگے بڑھ سکتی ہے۔ کیونکہ عوام میں ایمان و جہاد کی لہر پیدا ہو گی تو معاشرہ نظامِ صالح کو لانے اور سہارنے کے قابل ہو گا، اور اسی طرح صالح قیادت بروئے کار آ سکے گی۔

اصلاحِ خلق کا کام، خالق کے ساتھ اپنا اور خلق کا تعلق جوڑے بغیر ممکن نہیں۔ یہ کام کٹھن بھی ہے، اور خلق کے ساتھ مشغولیتِ نفس اور جماعت کے لیے گوناگوں خطرات سے پُر بھی۔ ہم اس مقصد کے لیے کرنے کے کام، شرائط اور حکمت بھی بیان کریں گے، مگر پہلے یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق صحیح کرنا معاشرہ کی اصلاح کرنے کے لیے اوّلین اور ناگزیر شرط ہے، اور خلق کو خالق کے ساتھ جوڑنے کی کوشش، اجتماعی اصلاح کی سعی کا مرکزی نکتہ۔

اللہ کے ساتھ صحیح تعلق کا پہلا اور اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ آپ اصلاحِ خلق کا جو کام بھی کریں --- یہ کام تعلیم کا ہو، تذکیر کا ہو، روابط کا ہو، خدمت کا ہو، ظلم اور منکرات کے خلاف جدوجہد کا ہو --- صرف اللہ کے لیے کریں، اس کی آگ سے بچنے کی فکر میں اور اس کی جنت کے لالچ میں کریں۔ ہر کام کرتے ہوئے آپ اس بات کو اپنے دل میں تازہ کریں، آپ کی نگاہ مخلوق کے چہروں پر نہ ہو بلکہ اپنے رب کے "وجہ کریم" پر ہو، اور آپ نبی کریمؐ کی طرح دعا مانگتے رہیں کہ اس پر نظر رکھنے میں اللہ آپ کے لیے لذت بھی پیدا کر دے، لذۃ النظر الی وجھک الکریم، اور آپ کے عمل کو ریا سے پاک رکھے۔ گویا آپ کثرت سے اللہ کو یاد کریں، صبح شام یاد کریں، اور کھڑے بیٹھے لیٹے یاد کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کام کرنے والوں کی تصویر کھینچی ہے۔

آپ کی نگاہ نہ اپنی مقبولیت پر ہو نہ جماعت کی، نہ دونوں پر ہو، نہ دنیا میں کامیابی پر۔ یہاں تک کہ

اس پر بھی نہ ہو کہ آپ کے ہاتھوں لوگوں کی اصلاح ضرور ہی ہو جائے، ظلم کا ازالہ ہو جائے، یا دینی بیداری کی لہر پیدا ہو جائے۔ اگرچہ دولت ہدایت عام ہو جانے اور فتح و نصرت نصیب ہونے کا محبوب ہونا عین مطلوب ہے، مگر جب تک آپ کے پیشِ نظر صرف اپنے رب کے سامنے معذرت کا سامان کرنا اور اس کے غضب سے بچ کر اس کا انعام حاصل کر لینا نہ ہو، نہ آپ کی کوششیں بارگاہ الٰہی میں قبول ہوں گی، نہ آپ اس کٹھن کام کے لیے ہر مایوسی سے بچتے ہوئے مسلسل محنت کر سکیں گے، نہ اس پُرخطر راہ پر محفوظ و مامون چل سکیں گے، نہ لوگوں کے دل آپ کے لیے کھلیں گے، اور نہ آپ کو خلافتِ ارضی نصیب ہو گی۔ ایک دفعہ آپ اس طرح حنیف بن جائیں کہ، ہر ڈوبنے والی چیز کی محبت سے منہ موڑ کر، اپنا رخ صرف اللہ کی طرف کر لیں، اور اس میں کسی کو بھی شریک نہ کریں، پھر آپ اپنی اصلاحِ خلق کی کوششوں میں برکتوں کا نظارہ خود کر لیں گے، الا ماشاء اللہ۔

اللہ کے ساتھ تعلق کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ، اگرچہ آپ عوام کی تعلیم و تربیت کے لیے سرتوڑ کوششیں کریں اور یہ کام جان مار کر کریں، مگر یہ پکا یقین رکھیں کہ اگر کوئی شخص اللہ کی طرف جھکے گا یا ملک میں اجتماعی دینی بیداری کی کوئی لہر پیدا ہو گی، تو یہ آپ کی کوششوں اور پروگراموں سے نہیں، بلکہ صرف اللہ کے کرنے سے ہو گی۔ وہی فاعلِ حقیقی ہے۔ کسی کو صحیح راہ پر لگا دینا تو انبیا کے بس اور اختیار میں بھی نہیں (البقرہ ۲ : ۲۶، القصص ۲۸ : ۵۶)۔ ہو سکتا ہے کہ سیکڑوں سال کی کوششوں کے باوجود چند ہی دل بیدار ہوں (قومِ نوح)، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ، نبی کے مایوس ہو جانے کے بعد بھی، چند لمحوں میں پوری قوم میں ایمان کی لہر دوڑ جائے (قومِ یونس)۔ یقین رکھیے کہ لوگوں کے دل اللہ کی انگلیوں کے درمیان ہیں، اور وہ ان کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ وہی ان کو نیکی کی طرف مائل کر سکتا ہے، اور جب چاہے، دیکھتے دیکھتے کر سکتا ہے۔ اس بات سے تاکید کے ساتھ روکا گیا ہے کہ آپ کسی کام کا منصوبہ بنائیں اور سوچنے لگیں کہ ہم یہ اور یہ کر لیں گے، اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کے یقین کے بغیر، اپنی طاقت کا زعم یا اس کے بل پر کامیابی کا بھروسہ، فتح کو شکست میں بدل سکتا ہے۔ بظاہر اپنے کیے ہوئے کاموں سے نتائج برآمد ہو رہے ہوں، جب بھی یہی سوچ اور یہی یقین ہونا چاہیے کہ یہ ہمارے کرنے سے نہیں ہوا، اللہ نے کیا تو ہوا: "تم نے ان کو (بدر کے میدان میں) قتل نہیں کیا، اللہ نے قتل کیا، تم نے خاک نہیں پھینکی، اللہ نے پھینکی"۔ اللہ سے یہ تعلق ہو تو مایوسی پاس بھی نہیں پھٹک سکتی، اگرچہ آپ کو ذرّہ برابر بھی کامیابی نہ ہو۔

لیکن یہ بات بھی ہر وقت یاد رکھنا، اور زبان سے دہرانا ضروری ہے۔ اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ اصلاحِ خلق کے ہر کام سے پہلے چند لمحے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر، دل و زبان سے، اس سے کہیں کہ "اے اللہ، تیرے حکم کی تعمیل میں، اور تیری خاطر، میں یہ کام کرنے چلا ہوں، میرے کرنے سے کچھ نہ ہو

گا، تو ہی اس کو نتیجہ خیز کر اور قبول کر"۔

مخلوقِ خدا کے دلوں کو بیدار کرنے کے لیے آپ ان کو بھی کثرت سے یہی دو باتیں یاد دلائیں، اور انھی کی تذکیر و تلقین کریں: ایک، بھائی، یہ کام (ہر کام) صرف اللہ کے لیے کریں تاکہ آپ اس کی آگ سے بچ جائیں اور وہ آپ کو اپنی جنت میں داخل کر دے۔ دوسرے، بھائی، اللہ مالک ہے! سب اسی کے کرنے سے ہوتا ہے، ہمارے آپ کے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا کام تو بس یہ ہے کہ کوشش میں جان لڑا دیں۔

جو اللہ کے پاس ملنے والا ہے اس کی قدر و قیمت اور دنیا کی بے قدری، اور اللہ کی قوت پر یقین اور اسبابِ دنیا کی بے وقعتی جتنی ان دو باتوں کی تلقین و تذکیر ہوگی اتنی ہی دلوں کی وہ کھیتی تیار ہوگی جو نیکی کی لہلہاتی ہوئی فصل دے سکے۔ اس غلط فہمی میں بھی نہ پڑ جائیں کہ یہ باتیں صرف دین داروں ہی پر اثر کریں گی۔ نہیں، گناہگار اور فاسق ہوں یا دین سے لاپروا اور برگشتہ، یا بالکل ماڈرن، ان میں بھی آپ قبولیت اور آمادگی پائیں گے، اور ان پر جو اثر یہ باتیں کریں گی وہ لمبی لمبی تقریریں نہیں کریں گی۔

اس طریقہ تربیت کی حکمت حضرت عائشہؓ نے صحیح بخاری کی ایک روایت میں یوں آشکار کی ہے:

> قرآن مجید میں سب سے پہلے "مفصل" کی (سورتوں میں سے) ایک سورت نازل ہوئی، جس میں جنت اور دوزخ کا ذکر ہے۔ جب لوگ اللہ کے آگے سپردگی کے لیے تیار ہو گئے، تو حلال اور حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، تو لوگ کہتے ہم ہرگز شراب نہ چھوڑیں گے، اور اگر یہ حکم اترتا کہ زنانہ کرو، تو وہ کہتے کہ ہم ہرگز زنا نہ چھوڑیں گے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ آپ اپنے دل میں وہ چنگاری سلگائیں جو آپ خلق کے دلوں میں سلگا کے، ان میں ایمان کی حرارت پیدا کرنا اور ان کے دلوں کو نیکی کے لیے نرم کرنا چاہتے ہیں: دوزخ کا خوف اور جنت کی طلب، اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت، بندوں کی خدمت کے لیے سوز اور دردمندی، خالص دنیا والوں کی طرح ہر دنیوی سبب کو استعمال کرنا، لیکن خالص تارکینِ دنیا کی طرح صرف رب پر بھروسہ کرنا۔ ان سب کا سرچشمہ تعلق باللہ کے درج بالا دو تقاضوں میں ہی مضمر ہے۔

اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ آپ کے اپنے اندر یہ چنگاری نہ ہو تو آپ خلقِ خدا کے اندر اسے سلگانے کے لیے کام نہ کریں۔ اپنی اصلاح الگ فریضہ ہے، دوسروں کی اصلاح الگ فریضہ۔ ایک فریضہ

کے ادا نہ ہونے سے دوسرا فریضہ ساقط نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ فاسق و کافر کی بات سے بھی دلوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ ان میں کوئی ایسی ترتیب ہے کہ پہلے خود "کچھ" بن جائیں، پھر دوسروں کو بنانے کے لیے نکلیں۔ اپنے "کچھ" بن جانے کی منزل کبھی نہیں آئے گی، اور کبھی آپ نے سوچا کہ آگئی تو اسی وقت آپ "کچھ" بھی نہ رہ جائیں گے۔ کیا عجب کہ دوسروں کو کہتے کہتے، اور اپنے تضاد کی خلش کی کسک سے، ایک دن خود اپنے دل میں یہ دیا جل اٹھے۔

تیسری بنیادی شرط یہ کہ آپ دل اور عمل کو کبر سے پاک رکھیں، اور تواضع کی رَوِش اختیار کریں۔ جب آپ خود کو "کچھ" نہ سمجھتے ہوں، اور اصلاح کرنے والا بھی خود کو نہ سمجھتے ہوں، تو کبر کی جڑ تو خود بخود ہی کٹ جائے گی۔ اِصلاحِ خلق کے کام کی روح یہ ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں، خود کو کچھ بنانا چاہتے ہیں۔ آیئے، آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں، جو کام ہم تنہا نہیں کرسکتے وہ آپ کے شریک ہو جانے سے ہو جائے گا۔

چوتھی بنیادی شرط یہ ہے کہ آپ کے پاس علم ہو۔ کتنا علم؟ اس کا تعین کرنا ممکن نہیں، نہ ضروری ہے۔ آپ اصلاح کا کام کہاں کر رہے ہیں؟ کن لوگوں میں کر رہے ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کی سیکھنے کی استعداد کتنی ہے؟ ان تمام چیزوں کے لحاظ ہی سے مقدار کا تعین ہو سکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ مقدار ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہو گی۔ ایک مسلمان پر جو کم سے کم علم حاصل کرنا فرض ہے، وہ بھی اس کام کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ اتنا جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی بندگی اور اطاعت کا مستحق نہیں، وہ ہر چیز کا مالک ہے، ہر چیز اس کی بخشی ہوئی ہے، اس سے بڑا کوئی نہیں، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اس کے علاوہ کسی کے پاس کوئی اختیار اور قوت نہیں، وہ ہر چیز جانتا ہے، وہ ہر جگہ میرے ساتھ ہے، مرنے کے بعد میں اس کے سامنے کھڑا ہوں گا، مجھ سے ہر نعمت کے بارہ میں سوال کیا جائے گا، "میرا آج کا ہر عمل میرے سامنے ہو گا"، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا: وہ سب اللہ کی طرف سے ہے جس کی اطاعت کرنا ضروری ہے، اور اللہ نے ہماری امت اس لیے بنائی ہے کہ ہم اس کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائیں اور اس کا دین قائم کریں، اس مقصد کے لیے جہاد سب سے چوٹی کا عمل ہے اور اس راہ میں شہادت سب سے بڑی سرفرازی --- تو اتنا علم اس دعوت و تذکیر اور تعلیم و تربیت کے لیے کافی ہے جو ایک بے پڑھا لکھا اور عام آدمی بھی کر سکتا ہے، اور جو معاشرہ میں دینی بیداری کی ایک لہر پیدا کر دے۔ رہے اخلاقِ حسنہ اور عبادات، تو وہ "معروف" ہیں۔

کئی مثالیں موجود ہیں کہ بعض لوگ ایمان لائے، اور رسول اللہؐ نے ان کو صحابی اپنے قبیلہ کی

طرف داعی اور مصلح بنا کر بھیج دیا، کسی نے قرآن کی ایک آیت سنی اور وہی اس کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ بھی ہوا کہ عام تاجر اور سپاہی کہیں جا کر رہے اور بستی کی بستی اسلام میں داخل ہو گئی۔

یہاں اس سے زیادہ علم کے حصول کی --- اور زیادہ علم کی کوئی حد نہیں --- ضرورت کو ہلکا کرنا یا اس کا انکار مقصود نہیں، بلکہ کم سے کم ضروری اور بنیادی علم رکھنے والوں کو بھی اصلاحِ خلق کے کام کے لیے کھڑا کرنا مقصود ہے۔

آج کرنے کے کام کیا ہیں کہ اصلاح اجتماعی کی سعی موثر ہو۔ اکثر کام وہ ہیں جو عرصہ سے جماعت اسلامی کے منصوبوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں، لیکن آپ انھیں کر نہیں رہے۔ یا کر رہے ہیں تو ان میں تاثیر نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے اوپر جن شرائط کا ذکر کیا ہے، اگر آپ ان کے حصول کا اہتمام کریں گے تو جو لکھا ہوا ہے اور نہیں ہو رہا، وہ بہت کچھ ہونے لگے گا۔ تاثیر اللہ کے ہاتھ میں ہے، لیکن ہمیں اس سے پُرامید رہنا چاہیے کہ وہ اس سے بھی محروم نہ رکھے گا۔

اکثر تیر بہدف پروگراموں کی فرمایش ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بنیادی اصول سامنے رہنا چاہیے۔ انسان پر اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے دل کو بدل دے یا اس کو نیک بنا دے۔ یہ کام تو خود انسان کے کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو بھی جو "تیر بہدف" تدابیر بتائیں ان کا خلاصہ یہی ہے کہ لوگوں کو دعوت دو (حکمت کے ساتھ)، انھیں تذکیر کرو، انھیں انذار کرو، خوش خبری سناؤ، ان کو ان کے بارہ میں قولِ بلیغ سے وعظ و نصیحت کرو (موعظہ حسنہ)۔ ہاں، اخلاق و حکمت کے موتیوں کے خزانوں کی کنجیاں اس نے ضرور، اپنے نبیؐ کی معرفت، ہمارے ہاتھ میں تھمائی ہیں، جن موتیوں سے یہ عام اور معروف نسخے کارگر موثر ہو سکتے ہیں۔

جماعت اسلامی کے پانچ سالہ منصوبہ میں دعوت و تربیت کے ذیل میں ہر جز ہمارے عوامی تعلیم و تربیت کے پروگرام میں شامل ہونا چاہیے۔ لیکن ہم اس کے سیاق ہی میں ایک مختصر سا منصوبۂ عمل یہاں تجویز کر رہے ہیں:

۱۔ عام لوگوں سے میل جول اور ربط ضبط: الگ تھلگ رہنے کی، صرف اپنے محدود دائرہ میں ربط ضبط رکھنے کی رَوِش ترک کر دیجیے۔ اور عوام سے میل جول رکھیے، ان میں گھُل مِل جائیے۔ برسوں کی عادات اور مزاج کو اکھاڑنے میں اور نئی روش اختیار کرنے میں محنت لگے گی، وقت لگے گا، مزاج اور ماحول کی رکاوٹیں درپیش ہوں گی، لیکن عوام میں گھُلے ملے بغیر ان میں کوئی اصلاحی

تحریک برپا نہیں ہو سکتی۔

چند کام ہیں جو اس مقصد کے لیے مفید ہو سکتے ہیں :

عام لوگوں کو، اپنے سے کم حیثیت کے لوگوں کو، اجنبی لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کرنا۔

ان کی خوشی اور غم میں شریک ہونا۔

ان کی عیادت کو جانا، ان کے جنازوں میں شریک ہونا، ان کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانا، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔

عام چائے خانوں اور ریسٹورانوں میں جا بیٹھنا، گفتگو سننا اور کرنا۔

اسی طرح باقاعدگی سے کبھی کبھی ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرنا، شہر میں پبلک ٹرانسپورٹ پر بیٹھنا، لوگوں کی باتیں سننا، اور ان سے بات چیت کرنا۔

اس میل جول سے ایک طرف باہمی اعتماد پیدا ہوگا اور غیر رسمی دعوت و تذکیر کے مواقع ملیں گے، دوسری طرف آپ کو عام لوگوں کی سوچ اور جذبات اور ان کے مسائل کا علم ہوگا، اور آپ کو ان کی فطرت و نفسیات کا گہرا اور وسیع تجربہ بھی ہوگا۔ یہ بصیرت اصلاح کے کام کے لیے ناگزیر ہے۔

۲۔ **چلتی پھرتی دعوت و تذکیر** : رسمی تعلیم و تدریس اور میٹنگوں میں درس و خطاب کے ذریعہ دعوت و تذکیر کی افادیت محدود ہے۔ لیکن معمول کی صحبتوں، ملاقاتوں اور مجلسوں میں، معمول کی بات چیت اور گفتگوؤں کے ذریعہ، بغیر موضوع اور تقریر کے، بتدریج وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی خوراکوں کے ذریعہ، جو دعوت و تذکیر ہوتی ہے، وہ کہیں زیادہ موثر اور مفید ہوتی ہے۔ میں اس طریقہ کو "چلتی پھرتی دعوت و تذکیر" کا نام دیتا ہوں۔ ہمارا کام زیادہ سے زیادہ ایسی چلتی پھرتی خانقاہیں اور بھاگتے دوڑتے مدرسے بنائے بغیر نہیں ہو سکتا۔

دعوت و تذکیر اور وعظ و تلقین کے موضوعات وہی ہونا چاہییں جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان میں استغفار، توبہ اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کی تذکیر بھی شامل کیجیے۔ اصل ہدف دلوں کو بیدار کرنا رکھیے، فروعیات میں نہ پڑیے۔ دلوں کو بیدار کرنا اصلاح کے لیے ناگزیر ہے۔ دل بیدار ہو جائیں تو سارا معاشرہ سدھر جائے گا، اگر دل بگڑ جائیں تو سارا معاشرہ بگاڑ کی راہ پر چل پڑے گا۔

۳۔ **تعلیم قرآن** : عام لوگوں اندر اللہ تعالیٰ سے گہرا اور طاقت ور تعلق پیدا کرنے، ان کے اندر آخرت طلبی کی فکر مضبوط کرنے اور ان کو ایمان کی حلاوت و حرارت کی لذت سے آشنا کرنے کا کوئی نسخہ قرآن مجید کی تعلیمات کی براہ راست تعلیم و تبلیغ سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتا۔ شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ

میں: "مسلمانوں کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ عوام و خواص یکساں طور پر قرآن مجید کو سمجھ سکیں، اور چھوٹے بڑے سب قرآن کے معانی کا ادراک کر سکیں" (دیباچہ فتح الرحمٰن)۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بڑے سادہ اور خوب صورت الفاظ میں قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کی فہم کی اہمیت بیان کی ہے: "بتانے والے بجیرا بتائیں، جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں" (دیباچہ موضح القرآن)

شاہ ولی اللہ صاحب نے تعلیم قرآن کے لیے ایک منفرد طریقہ خود بھی اختیار کیا، اور اس کی وصیت بھی کی۔ وہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ "قرآنِ عظیم کا درس اس طرح دیں کہ صرف قرآن پڑھائیں، بغیر تفسیر کے۔ ساتھ ساتھ ترجمہ پڑھاتے جائیں۔ جہاں کوئی نحو یا شانِ نزول کا اہم مسئلہ آجائے وہاں ٹھہریں، اور اس پر گفتگو کریں۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد، درس میں جتنا قرآن پڑھا گیا ہو، اس کے مقدار کے برابر جلالین (تفسیر) پڑھائیں۔ اس طرح پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں"۔ (التفہیمات الالٰہیہ، ج ۲)

درسِ قرآن کا اپنا مقام اور فائدہ ہے، لیکن آپ گھر گھر اور محلہ محلہ براہِ راست قرآن مجید کے متن اور ترجمہ کی تعلیم کا ایک جال بچھا دینے کے لیے کمر کس کے کھڑے ہو جائیں۔ لفظی اور بامحاورہ، دونوں قسم کے ترجمے آپ کے پاس موجود ہیں۔ صرف لوگوں کو جمع کرنے اور ترغیب دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اندازے کی حد تک، لوگوں میں پیاس بھی ہے۔ ہمیں ایسے نیم خواندہ لوگوں کا تجربہ ہے جنھوں نے پورے قرآن کا لفظی ترجمہ اس طرح پڑھ لیا اور یاد کر لیا کہ ان میں کسی بھی مقام سے صحیح ترجمہ کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی۔ اس طریقِ تعلیم میں، یک طرفہ درس سننے کے مقابلہ میں، شرکا خود پوری طرح تعلیم میں شرکت کرتے ہیں اور محنت کرتے ہیں، اور انسانی تشریح و تفسیر کے مقابلہ میں متن سے براہِ راست تعلق قائم ہوتا ہے۔

قرآن کلاس میں ۵ تا ۳۰ افراد شریک ہو سکتے ہیں۔ کلاس چلانے والے کے پاس تفہیم القرآن، یا کوئی دوسری مختصر تفسیر ہونا چاہیے، تاکہ مشکل پڑے تو حل کی جا سکے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی جو قرأت صحیح پڑھ سکتا ہو، ایسی کلاس چلا سکتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے گھر، محلہ اور کام کی جگہ پر ایک نہ ایک کلاس قائم کرنا چاہیے۔ عورتوں میں، اس کام پر زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کے ذریعہ قرآن کی بڑے پیمانہ پر تعلیم نئی نسلوں تک منتقل ہو جائے گی۔ جو لوگ اہل ہوں وہ اپنا سارا فارغ وقت اسی کام میں لگا دیں۔

ان کلاسوں میں حدیث، سیرت، اور تطہیر افکار اور بیداریِ ذہن کے لیے دیگر کتابیں بھی پڑھ کر

سنائی جا سکتی ہیں۔ کوئی ایک فارمولا ہر جگہ نہیں چلے گا۔

۴- ماحول / صحبت: گفتگو، تعلیم اور تقریر سے کہیں زیادہ موثر ماحول اور صحبت ہوتے ہیں۔ ماحول تبدیل ہونے سے دنیا بدل جاتی ہے۔ ماحول تبدیل نہ ہو، تو ہو سکتا ہے کہ ساری تعلیم و تذکیر دھری کی دھری رہ جائے اور کوئی فائدہ نہ ہو۔ مخالف ماحول میں تربیت و استقامت کے لیے، تلاوت قرآن کی ہدایت کے بعد، ان لوگوں کی صحبت سے خود کو باندھ لینے کی ہدایت ہے "جو ہر وقت اپنے رب کو پکارتے ہیں، اور صرف اس کی رضا کے طلب گار ہیں" (الکہف)۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو، لوگوں کو بہتر اور صالح تر ماحول اور صحبت مہیا کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ خصوصاً گھر میں، خاندان میں، محلے میں، مسجد میں۔

۵- اپنا گھر: اپنے گھر پر آپ کو اختیار حاصل ہے۔ گھر کی اصلاح معاشرہ کی اصلاح کا سرچشمہ ہے، اور آج معاشرہ میں جتنا فساد بڑھ رہا ہے اس کا منبع بھی گھر ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اپنے گھر کے ماحول کی فکر کیجیے، اہل خانہ کو صالح صحبت فراہم کیجیے۔ گھر کو پاکیزہ رکھیے، گھر میں نیکی کی فضا قائم کیجیے، گھر کو قرآن مجید اور دین و اخلاق کی تعلیم کا مرکز بنایے۔ اس کے لیے رسمی اجتماع ضروری نہیں، گھر کو مستقل درس گاہ بنا دیجیے، فیضانِ نظر سے آداب سکھائیے، ثقافت سکھائیے، زبان سکھائیے۔ جو چیزیں گھر کا ماحول گندہ کرتی ہیں، حتی الوسع ان کو باہر کر دیجیے۔ گھروں میں ہلچل مچا دیجیے تاکہ کسی گندگی کا ٹکنا اور سانس لینا دشوار ہو جائے۔ کوئی آپ کے گھر میں آئے تو پاکیزگی اور نیکی کی خوشبو پائے۔ آپ کا گھر محلہ میں، خاندان میں ایک چراغ بن جائے، اور ایک صالح معاشرہ کا نیوکلیس۔

جب بنی اسرائیل ایک طرف چار سو سالہ غلامی کے نتیجہ میں ایمانی، اخلاقی اور ثقافتی فساد میں مبتلا تھے، اور دوسری طرف ان پر فرعون کا استبداد مسلط تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے گھروں ہی کو اپنی دینی زندگی کا نیوکلیس بنانے کا نسخہ دیا تھا (یونس: ۸۷)۔ آج جب کہ ہم سیاسی غلامی سے آزاد ہو کر بھی ثقافتی اور معاشی غلامی کے تسلط میں ہیں، اور خواب گاہوں تک میں کافرانہ ثقافت کا نفوذ ہے، معاشرہ کی اصلاح میں گھروں کو نیوکلیس بنانا ناگزیر ہے۔

۶- اپنا خاندان: ہمارے معاشرہ میں ابھی تک وسیع خاندان کا وجود باقی ہے، دُور دُور تک اَقربا سے رَوابط ہوتے ہیں، فاصلوں کو عبور کر کے بھی ہوتے ہیں، ان تعلقات کا لحاظ رکھنا بھی ہماری روایات میں شامل ہے۔ اس لیے گھر کے بعد، آپ خاندان کو اصلاح کی تحریک میں شامل کریں۔ سارے

اقربا کی ایک فہرست بنالیجیے، یہ دیکھیے کہ کون، کہاں تک، کیا کر سکتا ہے۔ کبھی سال میں سارے خاندان کو جمع کر لیجیے۔ ویسے بھی صلہ رحمی کے تاکیدی قرآنی حکم پر زیادہ سے زیادہ عمل کیجیے۔

۷- اپنا، محلہ اپنا پڑوس: محلہ میں آپ کا گھر ہے، اور محلہ والوں کے ساتھ آپ کا پڑوس ہے۔ اپنے گھر کے بعد یہ محلہ فطری طور پر وہ موزوں ترین مقام ہے جسے آپ کو اپنی اصلاحی کوششوں کا مرکز بنانا چاہیے۔ ان پڑوسیوں کا اکرام، ان سے خوش گوار روابط، ان کو ہدایا بھیجنا، ان کی ضروریات پوری کرنا، ان کی ایذا رسانی سے بچ کر ان کو راحت پہنچانا، یہ سب وہ فرائض ہیں جو اللہ اور رسول نے آپ پر عائد کیے ہیں۔ آپ یہ فرائض ادا کریں گے تو اس کی راہ کھل جائے گی کہ آپ اپنے محلہ والوں میں گھل مل جائیں اور محلہ کے ماحول کی اصلاح کر کے اس کو پاکیزہ بنائیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ ملک بھر میں مہمات چلاتے رہیں، اور محلہ والوں کے لیے اجنبی بنے رہیں کہ آپ کس دعوت کے علم بردار ہیں۔ محلہ کے مسائل میں دلچسپی لیجیے، دعوت و تذکیر کے مجلسوں اور ملاقاتوں کا اہتمام کیجیے۔ مسائل کے گرد آپ محلہ والوں کو منظم بھی کر سکتے ہیں، محلہ کمیٹیاں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کمیٹیاں محلہ کی ذہنی، اخلاقی اور ثقافتی زندگی کے تحفظ اور صحیح سمت میں نشوونما کا اہم کام انجام دے سکتی ہیں۔

۸- اپنی مسجد: فی الحال تو اجتماعی اصلاح بروئے کار لانے میں مسجد کا رول بہت محدود ہے۔ وہاں جانے والے لوگ بھی کم ہیں، اور عام زندگی پر مسجد کے اثرات بھی برائے نام۔ مُلّا کے خلاف مہم، مُلّا کے کردار، اور فرقہ واریت نے مسجد کی توقیر اور احترام میں مزید کمی کر دی ہے۔ لیکن مسجد ہی تو ملی زندگی کے احیا کا مرکز بن سکتی ہے۔ اسی لیے قرارداد ماچی گوٹھ کے اصلاحی پروگرام میں مسجد کی خدمت اور مسجد کے ساتھ تعلق کو خصوصی مقام دیا گیا ہے۔ مسجد ہی کے ذریعہ جو مذہبی عنصر پایا جاتا ہے اسے اصلاح کے کام کے لیے متحرک کیا جا سکتا ہے۔ پھر دعوت و تذکیر سے عملی نتائج حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگ نماز پڑھیں، صحیح طرح پڑھیں، اور آپ انھیں مسجد میں لائیں۔

سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ آپ خود باقاعدگی سے مسجد میں باجماعت نماز پڑھیں۔ آپ مسجد میں آنے والوں سے ربط ضبط بڑھائیں، ان کے گھر آئیں جائیں۔ موجودہ انتظام میں کوئی مقام بنانے کی کوشش سے اجتناب کریں، لیکن مسجد کے مسائل میں دلچسپی لیں اور اس کی خدمت کریں۔ یہ کام بے غرضی اور حکمت سے کرنا ضروری ہے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ آپ کسی بھڑوں کے چھتہ کو چھیڑ دیں۔

۹- خدمتِ خلق: عام لوگوں کے ساتھ ربط ضبط کا محور صرف زبانی دعوت و تذکیر کو نہ

بنایے، بلکہ عملاً ان کی مدد اور ان کی خدمت کے لیے جو بن پڑے وہ کیجیے۔ خدمت کے دائرہ کو صرف لوگوں کے کام کرانے تک محدود نہ کرلیجیے۔ بلکہ حدیث نبویؐ کے مطابق عمل کا دائرہ وسیع کیجیے، کہ مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے، ڈول میں پانی ڈال دینا بھی صدقہ ہے، سواری پر سوار ہونے میں مدد کرنا بھی صدقہ ہے، اپنی ایذا سے مامون رکھنا بھی صدقہ ہے، میٹھی اور دل نوازبات کرنا بھی صدقہ ہے۔ کام کرانے کے لیے بھی کھڑے ہوں تو اپنے سر ذمہ داری نہ لیجیے۔ یہی کہیے کہ میں کوشش کروں گا" کرنے والا تو اللہ ہے۔ وہ چاہے گا تو ہو جائے گا۔

۱۰۔ **جہاد کا مرکز و محور:** معاشرہ میں وسیع پیمانہ پر اصلاح کی لہراسی وقت تک پیدا نہ ہو گی جب آپ دعوت و تذکیر اور وعظ و تلقین اور ربط و ضبط کی ساری مساعی کا تعلق اعلائے کلمۃ اللہ، قیامِ قسط اور ملک میں خلافت راشدہ کے منہاج پر نظامِ صالح کے قیام کے لیے جہاد اور شوقِ شہادت کے ساتھ مربوط نہ کریں گے، یہاں تک کہ یہی اس کا مرکز اور روح ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بڑے پیمانہ پر بیداری، اور ایمان و اخلاق میں بہتری کی لہر اسی وقت پیدا ہوئی ہے، جب جذبۂ جہاد بیدار ہوا ہے۔ اسی لیے مجلسِ شوریٰ کی قرارداد میں اس نکتہ کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس موضوع پر پھر بھی ہم آیندہ تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ لیکن اس وقت مغرب کے ساتھ تہذیبی کشمکش، اور، جیساکہ منصوبہ اور قرارداد دونوں میں تجویز کیا گیا ہے، اور اہل کشمیر کے جہاد کے ساتھ اصلاحِ خلق کی تحریک کو مربوط کرنے کی اہمیت واضح کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

اصلاحِ خلق کا کچھ کام سب کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر کام سب نہیں کر سکتے، نہ ہر شخص سب کام کر سکتا ہے۔ آغاز تحریک ہی سے یہ حکمتِ عملی سامنے رہی ہے کہ لوگ اپنی اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ کام کریں جو وہ بہتر طریقہ سے کر سکتے ہوں۔ اسی لیے تشکیلِ جماعت کے بعد سید مودودیؒ نے تمام شرکا سے فرداً فرداً ملاقات کر کے ان کی صلاحیت اور ذوق کے لحاظ سے ان کو مختلف شعبوں کے لیے مختص کیا۔ اسی لیے قرارداد ماچھی گوٹھ کے عملی پروگرام میں علمی تحقیقات کے کام کے لیے یہ طے کیا گیا تھا کہ جو لوگ اس کام کی صلاحیت رکھتے ہوں "انھیں دوسری سرگرمیوں سے فارغ کر کے مختلف شعبوں میں علمی کام پر لگایا جائے"۔ اصلاحِ معاشرہ کی مہم بھی اسی طرح کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے کہ کچھ کام تو سب کریں، لیکن جو لوگ اس منصوبہ میں کسی مخصوص کاموں کے لیے موزوں ہوں ان کو دوسری سرگرمیوں سے فارغ کر کے انھی کاموں پر لگا دیا جائے۔

اصلاح خلق کا کام کرنے کے لیے جو حکمت اور اخلاق ناگزیر ہیں ان کی پابندی ضروری ہے، کہ ان کے بغیر کوئی عملی کوششیں بار آور نہیں ہو سکتیں:

۱۔ نرمی، شفقت و محبت اور سوز و دردمندی سے ہی دلوں کے تالے کھلتے ہیں، ان کا زنگ دور ہوتا ہے، اور وہ قبولیت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ عام لوگوں کی جہالتوں اور گناہوں کا مقابلہ سختی کے بجائے شفقت، اور غصہ و جھلاہٹ کے بجائے سوز اور دردمندی سے کریں، گناہوں سے نفرت کریں، لیکن گنہگاروں سے محبت کریں، کہ محبت سے دل فتح ہوتے ہیں۔ حضورؐ کے اُسوہ کو ہمیشہ سامنے رکھیے۔ آپؐ سخت دل، تُند خُو اور جھگڑالو نہ تھے۔ رحمت للعالمین، رؤف و رحیم، نرم دل اور نزاع و جدال سے اعراض برتنے والے تھے۔ فراخ دل اور فیاض تھے۔ عفو و درگذر سے کام لیتے تھے۔ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے تھے۔ یہ آپؐ کے اخلاق کریمانہ تھے کہ لوگ بدل گئے اور آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔

۲۔ نیکی اختیار کرنے میں سہولت اور آسانی پیدا کریں، اسے تنگ اور مشکل نہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے کہ وہ "تمہارے لیے یسر چاہتا ہے، عسر نہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "دین آسان ہے"، نیز یہ کہ "تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو نہ کہ تنگی پیدا کرنے والے"۔

۳۔ تیسیر دین کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ عام لوگوں کی نفسیات اور مشکلات (جن سے واقف ہونا ضروری ہے)، ان کی ذہنی اور عملی استعداد کے مطابق ہی بات کہیں، عمل کا مطالبہ کریں، اور عمل کی توقع رکھیں۔

۴۔ تیسیر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ آپ تدریج کو ملحوظ رکھیں۔ پہلے وہ باتیں لیں جن پر اتفاق ہے، پھر ان کی طرف بڑھیں جن پر اختلاف ہے اور تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ پہلے ایمان کی فکر کریں، پھر نماز اور خدمت خلق کی، پھر دین کی دوسری تعلیمات اور احکام کی۔ پہلے اتنا بوجھ رکھیں جو لوگ آسانی کے ساتھ اٹھا سکیں، پھر اس میں ان کی استعداد میں اضافہ کے تناسب کے مطابق اضافہ کریں۔

۵۔ عام لوگوں کی مشکلات، مسائل اور کمزوریوں کا لحاظ رکھیں۔ اسی طرح ان کے رجحانات اور میلانات کا بھی۔ ان کی عام دنیوی دلچسپیوں میں شرکت کا بھی۔ نبی کریمؐ طویل قرأت کا ارادہ فرماتے، مگر کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی تو اس خیال سے مختصر فرما دیتے کہ بچہ کی ماں (جو جماعت میں ہو گی)

پریشان ہوگی۔ لوگ جس قسم کی بھی گفتگو کرتے۔۔۔ اگر وہ گناہ نہ ہوتی۔۔۔ تو آپؐ اس میں شریک ہو جاتے۔

۶۔ فروعیات اور جزئیات کے پیچھے نہ پڑیئے، ان پر زور نہ دیجیے نہ ان کے بارہ میں بحث اور جھگڑا کیجیے۔ اختلافی مسائل میں بھی اپنی رائے تھوپنے کی کوشش، اس کو منوانے پر اصرار اور اس کے بارہ میں مناظرانہ گفتگو سے کلیتاً اجتناب کیجیے۔

۷۔ سننے والوں کی سہولت اور آمادگی کو ملحوظ رکھیے۔ موقع بے موقع تقریر اور گفتگو کرنے، بے جا طول دینے اور بے ضرور تکرار سے پرہیز کیجیے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صرف جمعرات کو نصیحت کرتے تھے۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ روز کیا کریں، تو فرمایا: "میں اس لیے نہیں کرتا کہ تم پر گراں نہ ہو جائے۔ میں اسی طرح وقفہ کے ساتھ نصیحت کرتا ہوں جس طرح رسول اللہؐ ہمیں کرتے تھے کہ ہم بے زار نہ ہو جائیں"۔ (بخاری)

۸۔ جب آپ عام لوگوں کی اصلاح کا کام کر رہے ہیں تو انھی کی زبان اور بولی میں بات کریں۔ یہ نہ ہو کہ آپ علمی لٹریچر پڑھیں، اور اسی کو ان کے سامنے دہرا دیں۔ ثقیل الفاظ سے اجتناب کیجیے۔ بات جتنی اسان اور عام فہم ہوگی، اتنی ہی فصیح اور موثر ہوگی۔

۹۔ یاد رکھیے کہ ہر شخص میں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں، اور برائیاں بھی۔ آپ اس کی برائیوں ہی کو دیکھیں گے، ان ہی کا ذکر کریں گے، تو اس کی اصلاح مشکل سے ہوگی۔ آپ اس کی اچھائیوں کو دیکھیں، ان کا ذکر کریں، تو برائیاں بھی کم ہو جائیں گی۔ اس طرح لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ نہ کوئی شخص برائیوں سے پاک ہو سکتا ہے، نہ سب لوگ نیک بن سکتے ہیں۔ جو شخص جتنی اصلاح کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے، اسے قبول کر لیجیے۔ اور اصلاح کی کوشش جاری رکھیے۔

٦٠ سال پہلے

۱۸۵۹ میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of species) شائع ہوئی، جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریۂ ارتقا کی تائید میں پیش کیے تھے، کمزور اور محتاج ثبوت تھے، اور اس کے سلسلۂ ارتقا میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں، اور اہل حکمت اس وقت بھی اس نظریے سے مطمئن نہ تھے، حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا وکیل ہکسلے (Huxley) بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا، مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈارونیت کو قبول کر لیا گیا۔ اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی، اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلہ کے طور پر اسے استعمال کیا گیا، کیونکہ اس نظریہ نے اہلِ حکومت کے زعمِ باطل میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا، (حالانکہ دراصل ایک اور دعویٰ کیا تھا جو محتاج ثبوت تھا)، کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبیعی قوت کے بغیر خود بخود طبعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اہلِ مذہب نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسہ میں بشپ اف آکسفورڈ اور گلیڈ اسٹون نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا، مگر شکست کھائی۔ اور آخر کار اہلِ مذہب، سائنٹیفک دہریت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۱۸۸۲ میں جب ڈارون نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے وہ سب سے بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا، یعنی اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دی، حالانکہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا، اور اس نے افکار کو الحاد و زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا جس نے آخر کار بولشوزم کو پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

(سید ابو الاعلیٰ مودودی: ترجمان القرآن، ج ۵، عدد ۱، نومبر ۱۹۳۴، ص ٦-٧)

نوٹس لیجیے۔ خط لکھیے!!

اپنے وجود کا احساس دلایئے

معاشرے میں شہری سطح پر، قومی سطح پر اور عالمی سطح پر بے شمار ایسے امور واقع ہوتے ہیں جو ہمارے ایمان، ہمارے ضمیر اور ہماری روایات کے خلاف ہوتے ہیں۔ ہمیں برا لگتا ہے، ہم محسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں کھل کر اظہار کرنا چاہیے۔ **متعلقہ افراد اور اداروں کو خط لکھنا چاہیے۔**

کیوں؟

تاکہ

۱۔ انھیں معلوم ہو کہ ہم موجود ہیں، ہم بیدار ہیں۔

۲۔ ہمیں خود اپنی قوت کا احساس ہو۔

۳۔ اس طرح کے Issues پر نیکی اور خیر کی قوت جمع ہونے سے شر کی قوت کمزور پڑے گی۔

(ایک بندۂ خدا)

مثالی معاشرہ

جو افراد سنجیدگی کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ایک مثالی اسلامی معاشرہ وجود میں آئے، انھیں سب سے پہلے جو بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، وہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں اس کے لیے خواہش کی کوئی کمی نہیں۔ اصل کمی آمادگی کی ہے، اور اس سے بھی زیادہ کمی استعداد کی۔ بیش تر لوگ ان کم سے کم بنیادی اوصاف سے بھی خالی ہیں، جن کا ہونا اس کام کے لیے ناگزیر ہے۔ دوسری بات جس پر نگاہ رکھنی چاہیے، یہ ہے کہ ہماری قوم کے اندر جتنے باثر عناصر پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر بگاڑ کے لیے کام کر رہے ہیں، اور جو بگاڑنے میں لگے ہوئے نہیں ہیں، وہ سنوارنے کی فکر سے فارغ ہیں۔ اصلاح و تعمیر کے لیے کوشش کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تیسری بات جس سے غافل نہ رہنا چاہیے، یہ ہے کہ موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے والی سب سے بڑی طاقت حکومت ہے، اور جس جگہ جمہوری نظام رائج ہو وہاں حکومت کے صحیح یا غلط ہونے کا سارا انحصار اس امر پر ہے کہ عوام الناس صحیح آدمیوں کے ہاتھ میں اقتدار سونپتے ہیں یا غلط آدمیوں کے ہاتھ میں۔

یہ تین حقیقتیں مل جل کر ایسا بھیانک منظر پیش کرتی ہیں کہ ایک دفعہ تو اسے دیکھ کر آدمی کا دل بیٹھ جاتا ہے، اور وہ مایوسی کے ہجوم میں سوچنے لگتا ہے یہاں کچھ بنائے بن بھی سکے گا یا نہیں؟ لیکن ان کے مقابلے میں چند حقیقتیں اور بھی ہیں جنھیں نگاہ میں رکھنے سے مایوسی کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور امید کی شعائیں چمکنی شروع ہو جاتی ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ صرف فاسد عناصر ہی سے بھرا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ صالح عناصر بھی موجود ہیں۔ ان کے اندر اصلاح و تعمیر کی صرف خواہش ہی نہیں بلکہ آمادگی و استعداد بھی پائی جاتی ہے۔ اگر اس میں کچھ کمی ہے تو وہ تھوڑی سی توجہ اور سعی سے پوری کی جا سکتی ہے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم بحیثیت مجموعی شرپسند نہیں ہے۔ بے علمی،

نادانی کی وجہ سے وہ دھوکہ کھا سکتی ہے اور کھاتی رہتی ہے، لیکن وہ اس بگاڑ پر راضی نہیں ہے جو دھوکہ دینے والوں کے ہاتھوں رُونما ہوتا ہے۔ اگر حکمت کے ساتھ منظم اور پیہم سعی کی جائے تو یہاں کی رائے عام کو اصلاح پسند طاقتوں کو مؤید بنانے میں بالآخر کامیابی ہو کر رہے گی۔ مایوسی صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ قوم کا سوادِ اعظم خود ان برائیوں کا طالب ہوتا جو معاشرے میں مفسد طاقتوں کے غلبے سے برپا ہو رہی ہیں۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کے لیے کام کرنے والوں کو سب کچھ میسر ہے، مگر دو چیزیں میسر نہیں ہیں: ایک سیرت و کردار کی طاقت، دوسرے اتحاد و اتفاق۔

آخری اور سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ اقامت دین کا کام اللہ تعالیٰ کا اپنا کام ہے۔ اور اس کے لیے جو لوگ بھی کوشش کریں ان کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ اخلاص اور صبر کے ساتھ کام کریں اور حکمت سے غافل نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کی تعداد خواہ کتنی ہی کم ہو اور ان کے وسائل چاہے کتنے ہی قلیل ہوں، آخر کار اللہ کی تائید ہر کسر پوری کر دیتی ہے۔

مایوس کن ظاہر کے پیچھے امید کا یہ سروسامان ہے جو ڈھارس بندھاتا ہے کہ پاکستان میں ایک مثالی اسلامی معاشرے کا وجود محض ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا فائز المرام ہونا بھی متوقع ہے۔

البتہ ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ جو افراد بھی اس کام کی حقیقی خواہش رکھنے والے موجود ہیں وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی منزل سے نکل کر کچھ کرنے کے لیے آگے بڑھیں، اور ان طریقوں سے کام کریں جو سنت اللہ کے مطابق کامیابی کے لیے مقرر ہیں۔ سنت اللہ یہ نہیں کہ آپ بس خرابیوں پر تنقید کرتے رہیں اور وہ محض آپ کی باتوں سے دور ہو جائیں۔ جنگل کا ایک کانٹا اور راستے کا ایک روڑا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا جب تک آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں۔ پھر بھلا معاشرے میں مدتوں کی رچی بسی خرابیاں محض زبان کے پھاگ اڑانے سے کیسے رفع ہو جائیں گی۔ گیہوں کا ایک دانہ بھی کسان کی عرق ریزی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، پھر کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ معاشرے میں خیرات و حسنات کی کھیتی بس دعاؤں اور تمناؤں سے لہلہانے لگے گی۔ تنقیدیں کارگر ہوتی ہیں مگر اس وقت جب کہ عالمِ اسباب میں ہم اپنے کرنے کا کام پورا کر دیں، اور پھر اس کے بار آور ہونے کے لیے اللہ سے دعائیں مانگیں۔ فرشتے بلاشبہ اترتے ہیں، مگر خود سے لڑنے کے لیے نہیں، بلکہ ان اہل حق کی مدد کے لیے اترتے ہیں، جو خدا کی راہ میں جانیں لڑا رہے ہوں۔ پس جو لوگ بھی عمل کے لیے کوئی آمادگی اپنے اندر رکھتے ہوں، انھیں غلط توقعات اور بے جا امیدوں کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل سے اس کام کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے، اور پھر خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ انھیں یہ کام کرنا ہے، یا صرف بگاڑ پر نوحہ خوانی کرنے اور بناؤ کی آرزوئیں دل میں پالنے پر قناعت کرنی ہے۔

عمل کا فیصلہ جسے بھی کرنا ہو جوش میں آ کر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے سوچ کر کرنا چاہیے۔ وقتی جوش میں یہ طاقت تو ضرور ہے کہ آدمی اٹھے اور سینے پر گولی کھا کر جان دے دے۔ لیکن اس میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو چار دن بھی کسی ایک برائی سے اجتناب یا ایک بھلائی کے التزام پر قائم رکھ سکے کجا کہ اس کے بل بوتے پر کوئی شخص عمر بھر ایک مقصد کے پیچھے لگا تار محنت کرتا چلا جائے۔ تعمیری کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا سوچا سمجھا فیصلہ یہ ہو کہ انھیں اپنی عمرِ عزیز اسی کام میں کھپانی ہے۔

آمادگی عمل کے بعد لوگ عموماً لائحہ عمل کے سوال پر آجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اچھا، ہم نے کام کا فیصلہ کر لیا، اب بتاؤ کہ وہ پروگرام کیا ہے جس پر ہم کام کریں۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ فیصلۂ عمل اور لائحۂ عمل کے درمیان، مدار کار خود عامل کی ذات ہے، جس کو نظر انداز کر کے کام اور پروگرام کی باتیں شروع کر دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ عمل کے لیے صرف ارادہ عمل کافی ہے، جس کے بعد بس ایک لائحہ عمل ہی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اصل چیز پروگرام اور اسکیم نہیں، بلکہ اس کے چلانے والے لوگ اور ان کے اوصاف ہیں۔ ایک ایک فرد کے اوصاف بھی اور سب کے اجتماعی اوصاف بھی وہ اصل طاقت ہیں، جو اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اس اسکیم یا پروگرام کو کامیاب ہونا ہے یا ناکام۔ ان کی ہر کمزوری نتائج پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہر خوبی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ وہ عمدہ اوصاف کے مالک ہوں تو ایک غلط اسکیم اور بُرے لائحہ عمل کو بھی ایک دفعہ تو اس طرح چلا کر دکھا دیتے ہیں کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر ان کی صلاحیت ناقص ہو تو بہتر سے بہتر کام بھی بگڑ جاتا ہے، حتیٰ کہ دنیا کو خود اس کام کی صحت میں بھی شک ہو جاتا ہے جسے عمل میں لانے کے لیے نااہل لوگ میسر آئے ہوں۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی، "تحریک اسلامی کی کامیابی کی شرائط"، صفحہ ۵-۹)

اصلاحِ اُمّت کے لیے قرآن کی تعلیم عام

افادات شاہ ولی اللہ

شاہ صاحب ؒ نے اُمّت میں بگاڑ اور فساد کے علاج کے لیے قرآن مجید کے مطالعہ و تدبّر اور اس کے فہم کو سب سے موثر علاج سمجھا۔ اور یہ بات محض ذہانت، قوت مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی بدیہی حقیقت تھی جس پر قرآن مجید خود شاہد، اور نہ صرف عہدِ بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ دعوت اور سرگزشتِ اصلاح و تجدید گواہ ہے۔ خاص طور پر حقیقتِ توحید، اور حقیقت شرک کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے زیادہ واضح، اس سے زیادہ طاقتور، اور دل نشیں ذریعہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ترجمانِ قرآن شاہ عبدالقادر صاحب ؒ نے اپنے مقدمہ "موضح القرآن" میں جتنے سادہ اور دل نشیں انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، اس سے زیادہ مشکل ہے۔ فرماتے ہیں: "بتانے والے بہتیرا بتائیں، جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں۔

حجاز مقدس کے قیام میں شاہ صاحب ؒ کو ہندوستان کی اس دینی صورتِ حال، اور اس کی تعلیمات قرآن اور تعلیماتِ اسلام سے بُعد اور منافات کا احساس اور شدت سے پیدا ہوا ہوگا، اور وہاں کی نورانی، روحانی اور قرآنی فضا میں، جہاں سے توحید کا زمزمہ سب سے پہلے بلند ہوا، شاہ صاحب کے قلبِ بیدار میں اس کا داعیہ کہ وہ ہندوستان میں قرآن مجید کی دولت کو عام کریں ایسی وضاحت اور شدت سے پیدا ہوا ہوگا۔۔۔۔۔

شاہ صاحب کے زمانہ میں ہندوستان کیا، تقریباً تمام عجمی ممالک میں، جن میں ترکستان، ایران اور افغانستان، ہندوستان کے قریبی ہمسایہ تھے، اور انھی کے رجحانات، مشاغل، ذوق اور تسلیم شدہ حقائق کا سایہ ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں پر پڑتا تھا۔ یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قرآن مجید اخص الخواص طبقہ کے

مطالعہ، غور و فکر اور فہم و تفہیم کی کتاب ہے، جس کا سمجھنا ایک درجن سے زیادہ علوم پر موقوف ہے۔ اس کو عوام میں لانا، عوام کو براہِ راست اس کے مطالب سے واقفیت پیدا کرنے اور اس سے ہدایت اور روشنی حاصل کرنے کی دعوت دینا، سخت خطرناک، ایک بڑی گمراہی اور فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، اور عوام میں ذہنی انتشار، خودرائی، اور علما سے بے نیازی، بلکہ بغاوت اور سرکشی کی دعوت دینا ہے، اس طرزِ خیال اور دلیل کو ایک مختصر رسالہ، تحفة الموحدین، میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ شاہ صاحب کے نام اور نسبت کے ساتھ شائع ہوا ہے، لیکن یوں کہ شاہ صاحب کی تصنیفات و رسائل کے قدیم تذکروں اور فہرست تالیفات میں عام طور پر اس کا نام نہیں آتا۔ اس لیے جزم و وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شاہ صاحب کے قلم سے ہے۔ البتہ جو مضمون نقل کیا جارہا ہے وہ اس طرزِ خیال کی صحیح ترجمانی ہے، جو عام طور پر پھیلا ہوا تھا، اور اس میں اس کا جواب شافی بھی موجود ہے، اور یہ عوامی تعلیمِ قرآن کے بارہ میں شاہ ولی اللہ کی بنیادی فکر اور روشنی کا حامل ہے۔

بعض لوگ کہہ بیٹھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو بہت سے علم اور بے شمار کتابیں پڑھا ہوا ہو، اور اپنے زمانہ کا علامہ ہو۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ "خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے اَن پڑھوں میں پیغمبر بھیجا انھی اَن پڑھوں میں سے، پڑھتا ہے وہ پیغمبر ان اَن پڑھوں پر خدا کی آیتیں، اور ان کو گناہ کے میل سے پاک کرتا، اور کتاب اور اس کی تدبیر سکھاتا ہے"۔ (الجمعہ ۶۲: ۲) یعنی رسول خداؐ ان پڑھ اور آپؐ کے اصحاب بزرگوار بھی اَن پڑھ تھے، مگر جب رسولِ خداؐ نے اپنے اصحاب کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں، تو وہ ان کو سن کر ہر قسم کی برائی اور بگاڑ سے پاک صاف ہو گئے۔ پس اگر ناخواندہ آدمی قرآن و حدیث نہیں سمجھ سکتا، اور اس کی سمجھ کی استعداد نہیں رکھتا، تو صحابہؓ برائی اور عیبوں سے کیوں کر پاک صاف ہو گئے؟ اس قوم پر سخت افسوس ہے، جو "صدرہ" سمجھنے اور "قاموس" جاننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں، مگر قرآن و حدیث کو سمجھنے میں اپنے آپ کو محض نادان ظاہر کرتے ہیں۔

اور بعض یوں کہتے ہیں کہ ہم پچھلے لوگ ہیں، رسول اللہؐ کے زمانہ کی برکت اور صحابہؓ کے دل کی سلامتی کہاں سے لائیں، جو قرآن و حدیث کے معنی بخوبی سمجھ سکیں۔ ان کے جواب میں حق تعالیٰ فرماتا ہے: وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (الجمعہ

۶۲ (۳) یعنی پچھلے لوگ خواہ پڑھے ہوئے ہوں، یا اَن پڑھ مگر جبکہ وہ مسلمان ہوں، اور اصحاب کے طریقہ کی پیروی کا ارادہ کریں، اور قرآن و حدیث کو سنیں، تو انھیں بھی پاک کرنے کے لیے یہی قرآن و حدیث کافی ہو سکتی ہیں اور فرماتا ہے و لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ "اور البتہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے واسطے آسان کر دیا، پس کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے" (القمر ۵۴: ۲۲)۔ یہ کیونکر آسان ہو سکتی ہے کہ کافیہ پڑھنے والے اور "شافیہ" جاننے والے تو اس کے معنی سمجھنے سے عجز ظاہر کرتے، اور عرب کے جنگلی لوگ اس کی حقیقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک جگہ یوں فرمایا ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ "قرآن میں کیوں نہیں فکر کرتے" (محمد ۴۷: ۲۴)۔ پس اگر قرآن مجید آسان نہ ہو تو اس میں فکر کیوں کر کیا جائے۔ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا "یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں" (محمد ۴۷: ۲۴)۔ یعنی باوجودیکہ دلوں پر قفل نہیں لگے ہوئے ہیں، پھر بھی کیسی گمراہی ہے کہ قرآن کے فکر میں زور نہیں لگاتے" (تحفۃ الموحدین، ص ۵-۶-۷ المکتبۃ السلفیہ، لاہور)۔

لیکن بقول شاعر۔

نوا را تلخ تر می زن چوں ذوق نغمہ کمیابی
حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

شاہ صاحب نے اس بدمذاقی، بے توفیقی اور غلط اندیشی کو دیکھ کر جس کے حدود يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (الاعراف ۷: ۴۵) سے مل جاتے تھے، فیصلہ کیا کہ قرآن مجید کا اس سلیس فارسی زبان میں ضرور ترجمہ کرنا چاہیے جو ہندوستان میں قیامِ حکومتِ اسلامیہ کے بعد سے ملک کی دفتری، علمی، تصنیفی اور خط و کتابت کی زبان تھی، اور تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان اگر اس میں بول لکھ نہیں سکتا تھا تو اس کو سمجھتا ضرور تھا۔ ہندوستان میں فارسی زبان کی اس طویل عملداری میں، جس کی مدت سات صدیوں سے کم نہ تھی، قرآن مجید کے فارسی میں ایک درجن بھی ترجمے ہوتے تو تعجب کی بات نہ تھی، لیکن، حسن بن محمد علقمی المشتہر بہ نظام نیشاپوری ثم دولت آبادی کے ترجمے سے پہلے جو آٹھویں صدی ہجری کے علما میں تھے، کسی فارسی ترجمہ کا سراغ نہیں لگتا شاہ صاحب نے قرآن مجید کے فارسی ترجمہ کا کام، جس نے "فتح الرحمٰن" کے نام سے تکمیل پائی، حجاز سے واپسی پر (۱۰ ذی الحجہ ۱۱۵۰ھ) شروع فرمایا (اور ۱۱۵۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی)۔

دستِ تعاون بڑھایئے



الخدمت ویلفیر سوسائٹی (رجسٹرڈ) نے پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے تعاون سے کراچی کے پسماندہ علاقے ضلع غربی میں اورنگی ٹاؤن، قصبہ، علیگڑھ کالونی، بنارس اور قرب وجوار میں رہائش پذیر دکھی لوگوں کے لئے جدید اور معیاری سہولیات سے آراستہ ۱۰۰ بستروں کے ہسپتال کا منصوبہ تشکیل دیا ہے۔

اس منصوبے کے تعمیراتی اخراجات اور طبی آلات کا تخمینہ دو کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔

الخدمت ہسپتال

بالمقابل اورنگی ٹاؤن تھانہ، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی۔

فون:۔ فیکس:۔

الخدمت ہسپتال کی تعمیر کے لئے اپنے عطیات بنام الخدمت ویلفیر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ) اکاؤنٹ نمبر ۶/۲ مسلم کمرشل بینک، خداداد کالونی برانچ میں جمع کروائیں۔

الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ)

ضمیرِ بیدار

ہارون رشید حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ آیا ہوا ہے۔ وزیر فضل بن ربیع رات گئے تک اس کی حضوری میں رہتا ہے، اور پھر اجازت طلب کر کے سونے کے لیے اپنے خیمے میں چلا جاتا ہے۔ رات کا ایک حصہ گزر چکا ہے، فضل خوابِ نوشیں کے مزے لے رہا ہے، اچانک خیمے کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ فضل کی آنکھ کھل جاتی ہے، پوچھتا ہے: "کون؟" جواب ملتا ہے: "ہارون الرشید" فضل فوراً اٹھ کر خیمے سے باہر آتا ہے، دیکھتا ہے، امیرالمؤمنین، ہارون الرشید خیمے کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ عرض کرتا ہے: "امیرالمؤمنین! حکم فرماتے، غلام خود درِ دولت پر حاضر ہو جاتا"۔ ہارون کہتا ہے: "میرے دل میں ایک کھٹک پیدا ہوئی ہے، جسے کوئی عالم ہی دُور کر سکتا ہے، چلو کسی کے پاس چلیں"۔ دونوں سفیان بن عنیہ کے خیمے پر پہنچتے ہیں۔ سفیان جلدی سے باہر نکلتے ہیں اور کہتے ہیں: "امیرالمؤمنین! مجھے طلب فرما لیتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔"

ہم جس مقصد کے لیے حاضر ہوئے ہیں وہ پورا فرمایے"۔ ہارون کہتا ہے۔ کچھ دیر تک دونوں میں گفتگو رہتی ہے، پھر ہارون کہتا ہے: "آپ پر قرض ہے؟" "جی ہاں"۔ سفیان کہتے ہیں۔ "ابو العباس! ان کے قرض کی ادائیگی کر دو"۔ ہارون الرشید، فضل کو ہدایت کرتا ہے۔ پھر دونوں رخصت ہو جاتے ہیں۔ راستے میں ہارون، فضل سے کہتا ہے: "میرے قلب کو تو سامانِ تسلی نہ مل سکا"۔

"امیرالمؤمنین، اس طرف امام بن عبدالرزاق بن حمام بن نافع الحمیری الصنعانی اقامت پذیر ہیں"۔ "فضل ایک اور عالم ربانی کی نشاندہی کرتا ہے۔ "چلو انھیں کے پاس چلتے ہیں۔" دونوں عبدالرزاق بن حمام کے خیمے پر پہنچتے ہیں۔ فضل دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اندر سے سوال ہوتا ہے: "کون؟" "امیرالمؤمنین تشریف لائے ہیں"۔ فضل جواب دیتا ہے۔ عبدالرزاق فوراً خیمے سے باہر آتے ہیں اور کہتے ہیں: "امیرالمؤمنین! طلبی کا حکم صادر فرماتے، خود حضوری میں پہنچ جاتا۔"

"ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں اس کے لیے کچھ کیجیے"۔ ہارون کہتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بات چیت کے بعد دریافت کرتا ہے، "آپ پر کوئی قرض ہے؟" عبدالرزاق اثبات میں جواب دیتے ہیں۔

"ابو العباس ان کا قرض ادا کر دو"۔ ہارون، فضل سے کہتا ہے۔ پھر دونوں نکل آتے ہیں۔ راستے میں ہارون کہتا ہے "تمھارے یہ صاحب بھی میری تشفی نہ کر سکے، آؤ کسی اور کے پاس چلیں"۔

"ادھر حرم کے شیخ، ائمہ ہدیٰ میں سے ایک، فضیل بن عیاض تمیمی مقیم ہیں"۔ فضل ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہاں انھی کے پاس چلتے ہیں"۔ ہارون آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

دونوں فضیل کے خیمے پر پہنچتے ہیں۔ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں اور قرآن کریم کی ایک آیت بار بار دہرا رہے ہیں۔ نماز پڑھ چکتے ہیں، تو فضل دروازے پر دستک دیتا ہے۔ فضیل پوچھتے ہیں: "کون ہے؟" "امیرالمؤمنین تشریف لائے ہیں"۔ فضل جواب دیتا ہے۔ "مجھے امیرالمومنین سے کیا کام؟" فضیل اندر ہی سے کہتے ہیں۔

"سبحان اللہ! کیا امیرالمؤمنین واجب الاطاعت نہیں؟" فضل کہتا ہے۔

فضیل بن عیاض دروازہ کھول دیتے ہیں اور جھٹ سے چراغ گل کر کے خود ایک گوشے میں سمٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہارون الرشید اور فضل دونوں گھپ اندھیرے میں ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے انھیں تلاش کرتے ہیں۔ آخر ہارون الرشید انھیں ڈھونڈھ لیتا ہے۔ ہارون کا ہاتھ فضیل کے ہاتھ سے چھوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "کیا ہی نرم ہاتھ ہے اور اس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا اگر یہ قیامت کے روز عذاب الٰہی سے محفوظ رہے"! "آپ پر رحمت ہو ہم ایک غرض خاص کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں"۔ ہارون اپنی آمد کا سبب بیان کرتا ہے۔

"کون سی غرض اور کیسی غرض؟ آپ نے خود بھی اپنے نفس پر اعتماد کر لیا ہے اور آپ کے ساتھی بھی آپ کو اپنا مرکزِ اعتماد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ قیامت کے روز آپ ان سے اپنے گناہوں کا بار اٹھا لینے کو کہیں گے، مگر وہ انکار کر دیں گے۔ آج وہ آپ سے جتنی محبت اور شیفتگی کا اظہار کرتے ہیں، کل وہ اتنا ہی آپ سے دُور بھاگیں گے۔"

فضیل ایک لمحے کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔ خیمے میں بدستور تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ رات کے سکوت میں صرف سانس کی آمد و شد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر کہتے ہیں: "امیرالمؤمنین! عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب زمامِ خلافت ہاتھ میں لی، تو سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ، محمد بن کعب القرظی اور رجا بن حیوۃ کو طلب کیا اور کہا: مجھے اس آزمایش میں ڈال دیا گیا ہے، آپ کوئی مشورہ دیں، امیرالمومنین! انھوں نے اپنی خلافت کو آزمایش خیال کیا، مگر آپ اور آپ کے ساتھی اسے نعمتِ لازوال سمجھ کر اس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں، چنانچہ سالم نے جواب دیا "اگر آپ قیامت کے روز اللہ کے عذاب سے نجات

چاہتے ہیں، تو مسلمانوں میں جو بڑی عمر کا ہے اسے اپنے باپ کا ہمسر، جو اوسط عمر کا ہے اس کو اپنا بھائی اور جو چھوٹا ہے اسے اپنا بچہ سمجھیے۔ اپنے باپ کے ہمسر سے نیکی کے ساتھ پیش آیے، اپنے بھائی کو رحم و کرم سے نوازیے اور اپنے بچے پر شفقت کیجیے۔

رجاء بن حیوۃ نے کہا: اگر آپ قیامت کے روز عذاب الٰہی سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں، تو مسلمانوں کے لیے بھی وہی پسند کیجیے جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور جس شے کو اپنے لیے بُرا سمجھتے ہیں، اسے مسلمانوں کے لیے بھی بُرا سمجھیے۔ پھر جب چاہیں بے خوف و حزن اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دیجیے، اے امیرالمومنین! میں بھی آپ سے یہی کہتا ہوں۔ میں آپ کو اس دن کا خوف دلاتا ہوں، جب بڑے بڑے مضبوط قدم ڈگمگا جائیں گے۔ اللہ آپ پر رحم کرے، کیا آپ کے ساتھی عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھیوں جیسے ہیں؟ آپ کو انھی جیسی باتوں کی تلقین کرتے ہیں؟"

ہارون رو پڑتا ہے، اور اتنا روتا ہے کہ غش کھا جاتا ہے۔ فضل، فضیل بن عیاض سے کہتا ہے: "اے شیخ! امیرالمومنین کے ساتھ نرمی برتیے"۔

"ربیع کے بیٹے! تم نے اور تمھارے ساتھیوں نے امیرالمومنین کو قتل کر دیا ہے اور اب مجھے نرمی کی تلقین کرتے ہو۔" فضیل بڑے وقار سے جواب دیتے ہیں۔

ہارون کو افاقہ ہوتا ہے، تو فضیل سے کہتا ہے: "یا حضرت! کچھ اور فرمایے۔"

فضیل کہتے ہیں: "امیرالمومنین! عمر بن عبدالعزیز سے ایک گورنر نے شکایت کی: کام اتنا زیادہ ہے کہ سونے کو وقت نہیں ملتا۔ عمر نے انھیں لکھا: اے بھائی! دوزخی دوزخ میں ہمیشہ بیدار رہیں گے اور سو نہ سکیں گے۔ تم اس وقت کا تصور کرو، تمھیں ایک روز سوتے یا جاگتے میں اپنے رب کی طرف ہانک لے جایا جائے گا۔ تمھارے قدم اس راستے سے ڈگمگانے نہ پائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو، تمھارا شمار حق ناشناس لوگوں میں کیا جائے اور امید منقطع ہو کر رہ جائے۔ اس گورنر نے جب یہ مکتوب پڑھا، تو منزلیں مارتا عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں آن پہنچا۔ عمر نے پوچھا: کیسے آئے ہو؟، اس نے جواب دیا: آپ کے مکتوب نے میرے دل پر لپٹے ہوئے پردے چاک کر دیے ہیں۔ اب میں جیتے جی کسی ولایت کا والی بننا منظور نہیں کروں گا۔"

ہارون زار و قطار روتا ہے پھر کہتا ہے "کچھ اور فرمایے۔"

فضیل کہتے ہیں: "امیرالمومنین! نبیؐ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی، اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کسی علاقے کی خدمت عطا فرمایے۔ نبیؐ نے فرمایا: اے عباسؓ! ایسا نفس جسے تو زندہ و سلامت رکھ سکے، اس حکومت سے بہتر ہے جس کی ذمہ داریوں کا کوئی شمار

نہیں - حکومت قیامت کے روز حسرت و ندامت کا موجب ہوگی، لہٰذا حکمرانی کی تمنا سے دل کا دامن بچا سکتے ہو تو بچاؤ۔"

ہارون پھر دھاڑیں مار مار کر روتا ہے اور کہتا ہے: "اللہ کی رحمت آپ پر سایہ گستر ہو کچھ مزید فرمایئے"۔

فضیل کہتے ہیں "اے حسین و جمیل چہرے والے! حشر کے روز اللہ تجھ سے اس مخلوق کے بارے میں سوال کرے گا۔ اس چہرے کو آگ سے بچا سکتا ہے، تو بچا، اور زندگی کے شب و روز اس طرح گزار کہ تیرے دل میں اپنی رعایا کی جانب سے کوئی کھوٹ اور کینہ نہ ہو۔ نبیؐ کا ارشاد ہے: جس نے صبح اس حالت میں کی کہ اس کے دل میں رعایا کی طرف سے کینہ کپٹ بھرا ہوا ہے وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا"۔

ہارون پھر زار و قطار روتا ہے، پھر پوچھتا ہے: آپ پر کوئی قرض ہے؟ فضیل کہتے ہیں "جی ہاں میرے رب کا قرض ہے، جس کا وہ مجھ سے محاسبہ کرے گا۔ چنانچہ ہلاکت ہے میرے لیے جب میرا احتساب کیا جائے گا۔ ہلاکت ہے میرے لیے، جب مجھ سے پوچھا جائے گا اور ہلاکت ہے میرے لیے جب میری کوئی حجت کام نہ آئے گی۔"

ہارون کہتا ہے "میری مراد لوگوں کے قرض سے ہے" فضیل کہتے ہیں: "میرے رب نے مجھے اس کا حکم نہیں دیا۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کے وعدے کو سچ جانوں اور اس کی اطاعت بجالاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ - میں نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے سوا کسی اور غرض کے لیے پیدا نہیں کیا۔ مجھے ان سے نہ تو رزق حاصل کرنے کی خواہش ہے اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بے شک اللہ ہی رزاق اور استوار قوت والا ہے۔ (الذاریات ۵۰:۵۶-۵۸)

ہارون کہتا ہے: "یہ ایک ہزار دینار لیجیے اپنے اہل و عیال پر صرف کیجیے اور اپنے رب کی عبادت میں ان سے تقویت حاصل کیجیے۔"

فضیل کہتے ہیں "سبحان اللہ! میں نے آپ کو راستی کی راہ دکھائی اور آپ مجھے اس کا بدلہ دینا چاہتے ہیں"۔ فضیل خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہارون اور فضل کو بھی کچھ کہنے کی جرات نہیں ہوتی۔ اسی عالم خاموشی میں دونوں اٹھ کر باہر آتے ہیں۔ نویں رات کا چاند غروب ہو رہا ہے اور آسمان پر ستارے جھلملا رہے ہیں۔ ہارون ایک نظر اپنے گرد و پیش پر ڈال کر فضل سے کہتا ہے: "ایسے اصحاب ہوتے ہیں جن کی

مجھے جستجو ہے"۔

---

(۲)

یہ مردِ درویش، جس کے دامن میں بادشاہِ وقت اپنے دلِ مضطر کا سامانِ تسکین ڈھونڈھنے آیا ہے قرآن کریم کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ آج اس کی زندگی کتنی پاکیزہ اور تقویٰ و صلاح سے مزین ہے، مگر ایک زمانہ اس پر ایسا بھی گزرا ہے، جب یہ انسانیت کے عزو شرف سے محروم، کج روی اور غلط کاری کی پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ غارت گری اور راہزنی اس کا پیشہ تھا۔ ابی وردا اور سرخس کا درمیانی علاقہ اس کی ترکتازیوں کی جولاں گاہ تھا۔ ادھر سے گزرنے والا کوئی قافلہ اس کی دستبرد سے بچنے نہ پاتا۔ قرب و جوار کے علاقے میں اس کی دہشت اس طرح دلوں پر طاری تھی کہ لوگ اس کا نام سنتے ہی لرز اٹھتے، لیکن پھر ایک دن اچانک اس کے شب و روز میں انقلاب رُونما ہو گیا....... ایک عجیب و غریب انداز سے۔

قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔ دوسرے راہزنوں اور ڈاکوؤں کی طرح فضیل کے شب و روز بھی لوٹ مار، قتل و غارت گری اور سلب و نہب سے عبارت تھے، جیسا کہ ان ذمائم کا خاصہ ہے، قلب و نظر کی آوارگی اور اخلاق باختگی عموماً ان کے جلو میں آتی ہے۔ فضیل ایک لونڈی کے تیرِ نگاہ کے گھائل ہو گئے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت سے فراغت ملتی تو رات کی تاریکیوں میں چوری چھپے اس سے جا کر ملتے۔ ایک رات اس کے گھر کی دیواریں پھاند رہے تھے کہ کانوں میں آواز آئی۔ کوئی شخص قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔ پڑھنے والا پڑھ رہا تھا اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ "کیا اہل ایمان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے ڈر جائیں" (الحدید ۵۷: ۱۶)

ایک عجیب گھڑی اور طرفہ اتفاق تھا۔ رات کا ہیبت ناک سناٹا چار سو طاری تھا۔ ایک تو خود آیت ہی بڑی اثر انگیز تھی۔ اس پر پڑھنے والے کی سوزِ دل و جگر سے مملو آواز، غفلت و سرمستی کے پردے چیرتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، دل سے ملامت بھری ہوک اٹھی، آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور زبان بے اختیار پکار اٹھی: "کیوں نہیں، میرے پروردگار! وقت آگیا ہے۔"

اسی وقت کمین گاہ کی طرف لوٹے، راستے میں ایک قافلہ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ اہل قافلہ آپس میں محو گفتگو تھے، کچھ لوگ کہہ رہے تھے، اب یہاں سے کوچ کرنا چاہیے۔ کچھ کی رائے تھی رات یہیں گزارنی چاہیے۔ فضیل گھات میں بیٹھا ہو گا، دیکھتے ہی ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔ ان کی اس گفتگو نے فضیل کے

دل و دماغ کی دنیا کو گویا جھنجھوڑ ڈالا۔ سوچنے لگے : میری راتیں گناہوں میں کٹتی ہیں، مسلمان مجھ سے خوفزدہ اور نالاں ہیں، وہ میری بدولت بے خوفی سے نہ سفر کر پاتے ہیں نہ قیام۔ کیا مجھے ان مشاغل سے باز نہیں آجانا چاہیے؟ ان کے دماغ نے سوال کیا۔ اور دل کی زبان نے ترجمانی کرتے ہوئے جواب دیا ــــــ "اے اللہ ! میں تیری بارگاہ میں صدق دل سے توبہ کرتا ہوں، اور گناہوں کی یہ زندگی تج کر کے تیرے گھر کا جوار اختیار کرتا ہوں۔"

اب فضیل، وہ فضیل نہیں رہے تھے۔ ان کی زندگی کی کایا پلٹ چکی تھی، پتھر دل موم ہو چکا تھا۔ غفلت کیشی اور لذت پرستی کے بجائے اللہ کی محبت اور اس کا خوف ان کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ اب ان کی راتیں عبادت گزاری اور دن حصولِ علم میں گزرتے۔ قرآن اور حدیث کے بڑے بڑے ائمہ ان کے استاد تھے۔ سفیان ثوری، اعمش، یحییٰ بن سعید الانصاری، محمد بن اسحاق، حمید الطویل --- یہ وہ بحر زخار تھے جن سے فضیل سیراب ہوئے۔ اور اب علم و فقہ کی ان بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں کہ بڑے بڑے ہم عصر علما ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے شیخ سفیان الثوری بھی ان سے روایت کرتے ہیں۔ کردار کی عظمت و طہارت کا یہ عالم ہے کہ علم و عمل کے کوہ ہائے گراں انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ ابنِ مہدی کہتے ہیں: فضیل مرد صالح ہیں۔ عجلی کوفی کو آپ یہ کہتے سنیں گے: فضیل ثقہ، عبادت گزار اور مرد صالح ہیں۔ شریک کہتے ہیں: ہر قوم کے لیے اپنے دَور میں کوئی نہ کوئی شخص حجت ہوا کرتا ہے، اور فضیل اپنے عہد کے لوگوں کے لیے حجت ہیں۔ عبد اللہ ابن مبارک کہتے ہیں: فضیل سے بڑھ کر افضل شخص روئے زمین پر کوئی نہیں۔

سب سے بڑی شہادت ایک شخص کے غلام یا خادم کی ہو سکتی ہے، جس کو اپنے آقا کی خوبیوں اور کمزوریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فضیل کے خادم ابن الاشعث کہتے ہیں: "میں نے فضیل سے بڑھ کر کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کے دل میں اللہ کا خیال جاگزیں ہو۔ فضیل کی مجلس میں جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے یا وہ قرآن سنتے ہیں، تو ان پر خوف و حزن غالب آجاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور یوں زار و قطار روتے ہیں کہ حاضرینِ مجلس ان کی حالت پر ترس کھانے لگتے ہیں"۔

فضیل اپنی توبہ کے مطابق بیت الحرام کے جوار میں رہتے ہیں۔ بلادِ اسلامی کے دُور دراز گوشوں سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، اور زندگی کی تب و تاب حاصل کرتے ہیں۔ زہد و تورع اور شب زندہ داری تو خاصانِ خدا کی عمومی خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ فضیل، اکلِ حلال کے اہتمام میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ بشر بن الحارث کہتے ہیں: فضیل کا شمار ان دس آدمیوں میں ہوتا ہے، جو اکلِ حلال کے سوا

اپنے پیٹ میں کوئی چیز جانے نہیں دیتے۔

ذکرِ الٰہی فضیل کے نزدیک اصل زندگی ہے، اور اس سے محروم رہنے والی ساعتیں باعثِ حزن و ملال ہیں، ایسی ساعتیں انسان کو ریاکاری اور تصنع کا خوگر بناتی ہیں، اور خلوص اور رضائے الٰہی سے بیگانہ کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ سفیان ثوری اور فضیل مل کر رات بسر کرتے ہیں۔ باہمی مذاکرات میں رات کٹ جاتی ہے، صبح ہوتی ہے تو سفیان کہتے ہیں: "آج رات خوب بسر ہوئی، زندگی میں ایسی ساعتیں کم ہی میسر آتی ہیں۔" فضیل کہتے ہیں: "آج کی رات بڑی ہی بُری رات تھی، اللہ ایسی ساعتوں سے بچائے"۔ سفیان تعجب سے پوچھتے ہیں: "یہ کیسے؟" فضیل کہتے ہیں: "اگر ہم یکجا نہ ہوتے تو دونوں کی شب بیداری اللہ کے لیے ہوتی، ہر ساعت اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے میں گزرتی، لیکن آج رات بھر آپ کو یہ خیال دامن گیر رہا کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے میں کبیدہ خاطر ہوں۔ اسی طرح مجھے آپ کی رضامندی اور خوشنودی کی فکر رہی۔"

فضیل کی بلند نگاہی، خدا ترسی، سیر چشمی، اپنے اللہ پر اعتماد، توکل اور ماسوا سے بے نیازی کا اندازہ اس گفتگو سے کیا جاسکتا ہے جو ہارون الرشید سے ان کی ہوئی۔ اس گفتگو سے ان کے طرزِ فکر اور افتادِ طبع کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بادشاہِ وقت ان کے دروازے پر حاضر ہوتا ہے، لیکن اپنے بعض ہم عصروں کے برعکس جن کی علمی عظمت میں بلاشبہ کوئی کلام نہیں، وہ اس سے بے نیازی برتتے ہیں۔ آگے بڑھ کر خوش آمدید کہنے کے بجائے خود ان سے کترانے کی کوشش کرتے ہیں، اور پھر جو پند و نصیحت کرتے ہیں، اس میں مطلقاً اس امر کا لحاظ نہیں کرتے کہ ایک بادشاہ سے ہم کلام ہیں۔ لگی لپٹی بغیر دو ٹوک اور واضح باتیں کہتے ہیں۔ اسے اس کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہیں۔ اور اس روز کا خوف دلاتے ہیں جب وہ ان ذمہ داریوں کی جوابدہی کے لیے اللہ کے حضور پیش ہوگا۔ اس کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہیں۔ کہتے ہیں تم نے اپنے گرد و پیش جس قسم کے لوگ اکٹھے کر رکھے ہیں، جن کے مشوروں پر تم اپنے عمل کی بنیاد رکھتے ہو، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ آج وہ تمھارے اِردگرد اس لیے جمع ہیں کہ اقتدار تمھارے پاس ہے، کل جب یہ اقتدار چھن جائے گا اور تم بارگاہِ الٰہی میں اپنے کارنامہ ہائے حیات کا حساب دینے کھڑے ہوگے، تو یہ تمھارے قریب بھی نہ پھٹکیں گے۔ تمھارے ساتھ ان کی محبت کے دعوے جھوٹے اور والہیت و شیفتگی کی باتیں دھوکا ہیں۔ قیامت کے روز یہ تمھارے کسی کام نہ آئیں گے۔

کاروبارِ مملکت کے سلسلے میں تمھارا منہاجِ عمل اور خلقِ خدا کے ساتھ سلوک ایسا ہونا چاہیے جس سے قیامت کے دن عذابِ الٰہی سے محفوظ رہ سکو۔"

ہارون ایک خطیر رقم نذر کرتا ہے، تو اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں: "مجھے اس کی کوئی

احتیاج نہیں - اللہ نے میری ہر احتیاج پوری کرنے کا خود وعدہ فرمایا ہے - میرا کام یہ ہے کہ اس کے وعدے کی صداقت پر ایمان رکھوں اور اس کا مطیع و فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزاروں۔"

فضیل علمائے سُو سے بچنے کی اکثر تلقین کرتے ہیں۔ ایک بار ارشاد فرمایا: "علمائے سُو سے احتراز کرو۔ یہ اگر تم کو دوست رکھیں گے، تو تمھاری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں گے۔ جس کے تم سزاوار نہیں ہو اور اگر تم سے خفا ہوں گے، تو تمھارے خلاف جھوٹی شہادت تک دینے سے گریز نہیں کریں گے - اور وہ شہادت مان لی جائے گی۔"

ایک مرتبہ فرمایا: --- "غیبت علماء سو کا میوہ ہے، جس سے وہ اپنے کام و دہن کو لذت بخشتے ہیں۔"

ایک بار سفیان بن عیینہ کی مجلس میں حاضر ہوئے، تو فرمایا: "اے علما! تم شہروں کے چراغ تھے جن سے لوگ اکتساب نور کرتے تھے - اب تمھارے دامن میں تاریکی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پہلے تم ستارے تھے، مگر اب سیاہ گھٹا بن چکے ہو۔ جب تم حکام کے پاس جاتے ہو اور ان سے مال لیتے ہو تو کیا تمھیں شرم نہیں آتی؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ یہ مال و زر انھوں نے کہاں سے اور کیسے حاصل کیا؟ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم اپنی مسندوں پر ٹیک لگا کر بیٹھتے ہو اور کہتے ہو: حدثنی فلان عن فلان (یعنی احادیث رسولؐ بیان کرتے ہو)۔"

علمائے حق اور علمائے سو کی نشاندہی ان الفاظ میں فرمائی: "علمائے حق منکسر المزاج اور رقیق القلب ہوتے ہیں اور علمائے دنیا مغرور و متکبر، اور وہ عام لوگوں کو فرومایہ سمجھتے ہیں۔"

فضیل کے اقوال عارفانہ ژرف نگاہی اور گہرے مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں:

- جب اللہ کسی بندے کو دوست بناتا ہے تو مصائب اور رنج و حزن سے اسے آزماتا ہے اور جب دشمن بناتا ہے تو دنیا کے دروازے اس پر کھول دیتا ہے۔
- زبان سے اظہار محبت کرنے اور دل میں دشمنی رکھنے والے پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے۔
- دو عادتیں دنیائے دل کو تباہ کر دیتی ہیں۔ ایک بہت کھانا دوسرے بہت سونا۔
- اگر مجھ سے کہا جائے، ایک دعا مانگو جو ضرور قبول ہوگی، تو میں بادشاہ کی اصلاح کے لیے دعا مانگوں گا۔ کیونکہ اس کی اصلاح رعایا کی اصلاح ہے اور اس سے ایک دنیا کو فائدہ پہنچتا ہے۔
- ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے، عقل کی زکوٰۃ غم ہے۔
- دنیا ایک پاگل خانہ ہے اور اس میں لوگ دیوانوں اور پاگلوں کی مانند پابہ زنجیر مقید ہیں۔
- توکل یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھے اور اس کے ماسوا کسی سے نہ ڈرے۔

- اگر تم رات کو اٹھ کر نفل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہو، تو سمجھ لو کہ حرماں نصیب ہو اور گناہوں نے تمھیں گھیر لیا ہے۔
- جو شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کی باتیں سن کر واہ واہ کریں، تو اس کا دامن زہد و ورع سے خالی ہے۔

شیخ الاسلام امام القدوہ فضیل بن عیاض بن بشر التمیمی الیربوعی، ابوعلی الزاہد الخراسانی سے اور وہ اپنے شیخ اعمش سے ایک حدیث رسولؐ روایت کر رہے ہیں: "ام بشرؓ کہتی ہیں، رسول اللہؐ میرے کھجوروں کے باغ میں تشریف لائے۔ فرمایا: یہ باغ کس نے لگایا تھا؟ مسلمان نے یا کافر نے؟ میں نے عرض کیا: مسلمان نے۔ فرمایا: "مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کھیت بوتا ہے اور اس سے انسان، جانور یا پرندہ کچھ کھا لیتا ہے، تو وہ اللہ کے نزدیک صدقہ قرار پاتا ہے"۔

آیے! اس ارشاد کو حرز جان بنا کر اس محفل سے رخصت ہوں۔

اطلاع

احباب نوٹ کرلیں کہ ماہنامہ ترجمان القرآن کے انتظامی دفاتر 5 نومبر 1994 سے اچھرہ منتقل کیے جا رہے ہیں۔ ایجنٹ اور خریدار حضرات آیندہ تمام خطوط، آرڈر، رقوم درج ذیل پتہ پر بھیجیں۔

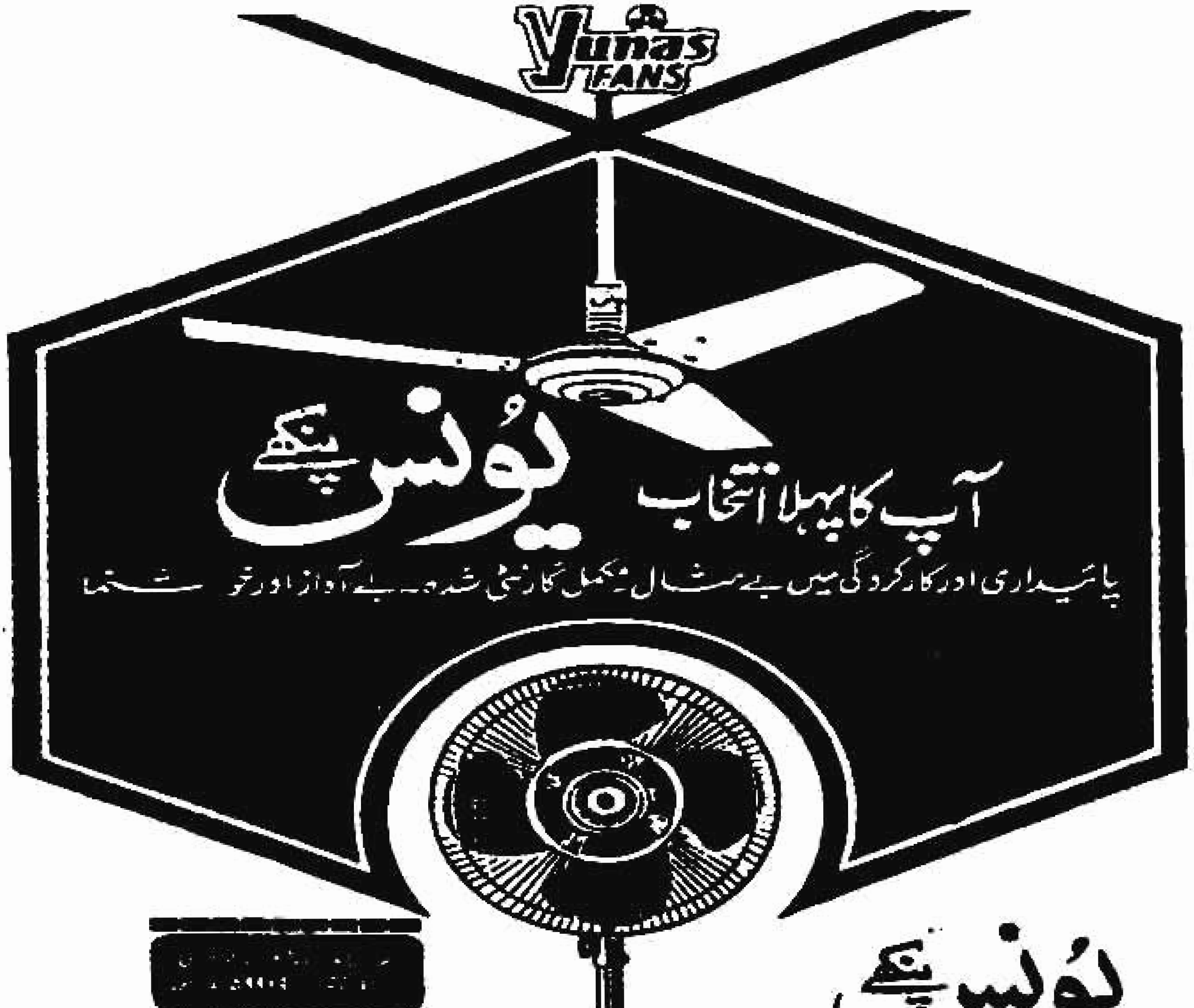
منیجر، ماہنامہ ترجمان القرآن - ۵ اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور۔

ٹیلیفون نمبر : 7587916 (سرکولیشن)

7585590 (انتظامیہ)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ

اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے اور تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند بنانے کے لیے۔



اِفتا و اِجتہاد

اِجتہاد کی حیثیت اور اِفتا میں احتیاط

حافظ ابن قیمؒ

مفتی کا کام انتہائی نازک کام ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، "جس شخص نے میری طرف ایسے قول کی نسبت کی جو میری زبان سے نہ نکلا ہو، وہ جہنم میں اپنا گھر بنا لے، اور جس شخص نے علم کے بغیر فتویٰ دیا، اس فتوے کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہو گا، اور جس کسی نے اپنے بھائی کو ایسا مشورہ دیا، جس کے بارے میں اسے علم ہو کہ درست مشورہ کچھ اور ہے' تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی"

جو نازک صورتِ حال مفتی کے لیے ہے وہی قاضی کے لیے بھی ہے۔ تاہم مفتی کی حیثیت اس لحاظ سے زیادہ نازک ہے کہ وہ اپنا فتویٰ ایک عام حکم کی صورت میں دیتا ہے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس پر یہ نتیجہ مرتب ہو گا۔ اس کے فتویٰ کا اطلاق، پوچھنے والوں اور نہ پوچھنے والوں، سب پر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قاضی معین شخص کے سلسلے میں معین فیصلہ سناتا ہے۔ مگر قاضی کی حیثیت اس لحاظ سے نازک ہے کہ اس کا سنایا ہوا فیصلہ محدود ہونے کے ساتھ ساتھ نافذ ہو جاتا ہے۔

علم کے بغیر اللہ کے نام پر فتویٰ دینے کی تحریم

اللہ تعالیٰ نے یہ حرام قرار دیا ہے کہ فتویٰ دیتے وقت، اور فیصلہ کرتے وقت، علم کے بغیر اس کے نام پر کوئی بات کہی جائے۔ اس حرکت کو اس نے نہ صرف عظیم محرمات میں شمار کیا ہے، بلکہ اسے محرمات کے سب سے اونچے درجہ میں رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں محرمات کے چار درجے بتائے ہیں: ابتدا میں سب سے کم تر یعنی بے شرمی کے کام کا ذکر کیا ہے۔ پھر اس سے شدید تر، یعنی گناہ اور ناحق زیادتی کا۔ تیسرے درجے

میں، اس چیز کا جس کی تحریم ان دونوں سے بڑھ کر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ اور پھر آخر میں اس چیز کا ذکر کیا ہے جس کی تحریم سب سے بڑھ کر ہے: وہ ہے اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہنا جس کے متعلق علم نہ ہو۔

اللہ کے نام پر بات کہنے میں ایسی تمام باتیں داخل ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے اسما، اس کی صفات اور اس کے افعال کے بارہ میں، یا اس کے دین اور اس کے احکام کے بارے میں کہی جائیں۔ ارشاد باری ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ، اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ، اور یہ جو تمھاری زبانیں جھوٹے حکم لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے (النحل ۱۶: ۱۱۶)۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کے سلسلے میں اس پر جھوٹ باندھنے پر وعید سنائی ہے۔ یعنی جس چیز کو اس نے حرام قرار نہیں دیا اسے حرام کہنا، اور جس چیز کو اس نے حلال نہیں کیا اسے حلال ٹھہرانا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح اعلان کیا ہے کہ بندے کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ بغیر سند یا اپنی رائے سے کسی چیز کے متعلق یہ حکم لگائے کہ یہ حلال ہے یا یہ حرام ہے۔ یہ بات کہنے کی صرف اس وقت اجازت ہے جب اسے یہ علم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو حلال قرار دیا ہے یا حرام ٹھہرایا ہے۔

اپنی رائے کی حیثیت اور حرام و حلال قرار دینے میں احتیاط

سلف میں سے ایک صاحب کا قول ہے کہ "اس بات سے بچنا چاہیے کہ تم میں سے کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز حلال کر دی ہے اور فلاں چیز حرام کر دی ہے۔ پھر اللہ اس کے جواب میں فرمائے کہ تم نے جھوٹ کہا، میں نے فلاں چیز حلال نہیں کی اور فلاں چیز حرام نہیں کی"۔ اس بنا پر جس چیز کی تحلیل و تحریم کے سلسلے میں وحی کے نزول کا علم نہ ہو، اس کے متعلق تقلید یا تاویل کے سہارے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال ٹھہرایا ہے یا حرام قرار دیا ہے۔

اپنے اجتہاد اور رائے کے بارہ میں یہ کہنا بھی مناسب نہیں کہ "یہ اللہ کا حکم ہے"۔ حدیث صحیح میں حضورؐ نے اپنے امیر لشکر، بریدہؓ کو اس بات سے منع فرمایا تھا کہ وہ دشمن کا محاصرہ کرنے کے بعد اسے اللہ کے حکم کے آگے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "بریدہؓ، ایسی صورت میں تمھیں یہ علم تو ہو گا نہیں کہ دشمن کے بارے میں تم نے اللہ کا حکم پا لیا ہے یا نہیں۔ اس لیے تم دشمن کو اپنے اور اپنے رفقا کے فیصلے کے آگے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہو"۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حضورؐ نے اللہ کے حکم اور

اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے والے امیر لشکر کے حکم کے درمیان کس طرح فرق رکھا ہے اور، اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے والوں یعنی مجتہدین کے حکم کو اللہ کا حکم کہنے سے منع فرمادیا ہے۔

اس کی ایک اور مثال بھی ہے۔ ایک دفعہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے سیکرٹری نے آپ کا ایک حکم نامہ تحریر کرتے ہوئے یہ لکھا کہ "یہ وہ حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین عمر کو سجھایا ہے"۔ آپ نے کاتب سے فرمایا "تم نے بُری بات کہی۔ یہ نہ لکھو، بلکہ یہ لکھو کہ یہ وہ حکم ہے جو عمر کی سمجھ میں آیا ہے۔ اگر ٹھیک ہو تو اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر ٹھیک نہ ہو تو عمر کی طرف سے ہے"۔ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ صرف رسول اللہ ﷺ کی رائے لازماً صحیح ہوتی تھی، اس لیے کہ آپ ﷺ کو خود اللہ سجھاتا تھا۔ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ۔ ہماری رائے تو صرف ظن اور تکلف ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: ایک چیز کے بارے میں یہ کہنا کہ "یہ حلال ہے" "یا" "یہ حرام ہے" نہ تو عام لوگوں کا وطیرہ تھا، نہ ہی ہمارے سلف کا، اور نہ ہی میں نے کسی ایسے شخص کو جس کی میں پیروی کرتا ہوں یہ فقرے کہتے ہوئے سنا ہے۔ انھیں یہ فقرہ کہنے کی جرات ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس لوگ صرف یہ کہتے کہ "ہم اس بات کو مکروہ سمجھتے ہیں" "یا" "ہمیں یہ بات اچھی لگتی ہے" "یا" "ایسا ہونا چاہیے" یا "ہماری رائے یہ نہیں ہے"۔

امام مالکؒ سے ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے : لوگ کسی چیز کے بارے میں نہ تو حلال کا لفظ استعمال کرتے، نہ حرام کا۔ کیا تم نے یہ قول باری تعالیٰ نہیں سنا: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ۔ ان سے کہیے کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا کہ جو رزق اللہ نے تمھارے لیے اتارا ہے، اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال کیسے ٹھہرالیا۔ ان سے پوچھیے، اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی یا، تم اللہ پر افترا کر رہے ہو۔ (یونس: ۵۹)

اسی لیے ائمہ کرام لفظ حرام کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے، اور اس کے بجائے مکروہ کا لفظ استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ امام احمد نے ملک یمین کے تحت دو بہنوں کو یکجا کرنے کے مسئلے میں فرمایا تھا، کہ میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں، اسے حرام نہیں کہتا۔ حالانکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ ایسا کرنا حرام ہے۔ انھوں نے تحریم کے لفظ کے اطلاق سے پرہیز کیا۔ یا انھوں نے کہا کہ سونے چاندی کے برتن میں وضو کرنا مکروہ ہے، حالانکہ ان کے نزدیک یہ ناجائز نہیں ہے۔ یا انھوں نے کہا کہ جب انسان کا اکثر مال حرام کا ہو، تو مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا کہ اس کا مال کھایا جائے، حالانکہ ان کی رائے میں ایسے مال کا نہ کھانا تحریم کی بنا پر ہے۔ یا انھوں نے فرمایا کہ "مجھے ان جانوروں کا گوشت کھانا اچھا نہیں لگتا جنھیں زہرہ یا دوسرے ستاروں کے لیے ذبح کیا گیا ہو۔ اسی طرح ہر اس جانور کا گوشت کھانا مجھے ناپسند

ہے جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو"۔ آپ غور کر سکتے ہیں کہ کس طرح امام احمد نے ان چیزوں کے متعلق "لا یعجبنی" (مجھے پسند نہیں ہے) کہا ہے جن کی تحریم اللہ تعالیٰ نے واضح طریقے سے بیان کر دی ہے۔ ان سے سُور کے بالوں کے متعلق پوچھا گیا، جواب میں فرمایا کہ "مجھے اچھے نہیں لگتے"۔ ان کا یہ قول بھی تحریم پر محمول ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اگر شراب کو سرکہ بنا لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہو گا؟ انھوں نے جواب میں فرمایا: "یہ مجھے اچھا نہیں لگتا"۔ حالانکہ ان کے نزدیک یہ تحریم پر محمول ہے۔

دوسرے ائمہ سے بھی اسی طرح کے جوابات منقول ہیں۔ امام محمد نے فرمایا ہے کہ مکروہ حرام ہوتا ہے، لیکن جب ہمیں اس بارے میں کوئی نص قاطع نہیں ملتا تو اس پر حرام کے لفظ کا اطلاق نہیں کرتے۔ امام محمد نے کہا کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے سونے چاندی کے برتنوں میں پینا مکروہ ہے، جبکہ ان کی اس سے مراد تحریم ہے۔ اسی طرح یہ فرمایا کہ ریشمی بستر پر سونا اور ریشمی تکیوں سے ٹیک لگانا مکروہ ہے، جبکہ اس سے مراد تحریم ہے۔ ان حضرات نے کہا کہ بچوں کو سونا اور ریشم پہنانا مکروہ ہے، جبکہ علما احناف نے تصریح کی ہے کہ ایسا کرنا حرام ہے۔ ان کا قول ہے کہ انسانی خوراک اور مویشیوں کے چارے کی ذخیرہ اندوزی ایسے زمانے میں مکروہ ہے جب اس کی قلت ہو، اور لوگ، نیز مویشی، اس کی کمیابی کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہوں، حالانکہ کراہت سے ان کی مراد تحریم ہے۔ ان حضرات کا قول ہے کہ فتنہ، یعنی مسلمانوں کی باہمی جنگ و جدل، کے دنوں میں اسلحہ کی فروخت مکروہ ہے۔ اس سے ان کی مراد تحریم ہے۔ اما ابو حنیفہ کا قول ہے کہ مکہ مکرمہ کی زمین کی فروخت مکروہ ہے، حالانکہ احناف کے نزدیک اس سے مراد تحریم ہے۔ ان کا قول ہے کہ اگر آقا اپنے غلام کو یا کسی اور کو لوہے کا طوق پہنا دے جس کی وجہ سے اس کے لیے ہلنا جلنا مشکل ہو جائے تو اس کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہو گا، حالانکہ یہ کام حرام ہے۔

امام مالکؒ کے اصحاب کے نزدیک مکروہ کا درجہ حرام اور مباح کے مابین ہوتا ہے۔ اس پر وہ جواز کا اطلاق نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنے اکثر جوابات میں فرمایا ہے کہ "میں یہ بات مکروہ سمجھتا ہوں" حالانکہ ان کے نزدیک یہ حرام ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ کی روش بھی یہی تھی۔ ان کا قول ہے کہ "شطرنج ایک فضول چیز ہے جو باطل کے مشابہ ہے۔ میں اسے ناپسند کرتا ہوں، لیکن میرے لیے اس کی تحریم واضح نہیں ہے"۔ اس طرح امام شافعی نے اس کی کراہت نصاً بیان کر دی ہے، لیکن اس کی تحریم میں توقف کیا ہے۔

مفتی جب اجتہاد سے کام لے تو کیا کہے؟

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو حرام قرار دیا ہے کہ اس کے اسما، اس کی صفات، اس کے افعال اور اس کے احکام کے بارہ میں یقین کیے بغیر اس کے نام سے کوئی بات کہی جائے۔ مفتی کا دیا

ہوا فتویٰ اللہ کے حکم کے مطابق نہیں ہو گا تو وہ علم کے بغیر اللہ کے نام پر بات کہنے کا مجرم گردانا جائے گا۔ لیکن اگر وہ حق معلوم کرنے کے لیے اجتہاد اور سمجھ بوجھ سے کام لے گا اور اس مقصد کے لیے اپنی پوری صلاحیت صرف کر دے گا، لیکن اس کے باوجود بھی اس سے غلطی ہو جائے، تو اس صورت میں وہ وعید کا سزاوار قرار نہیں پائے گا۔ اس کی یہ خطا نہ صرف قابل معافی ہو گی بلکہ معرفت حق کی خاطر اپنی حد تک اس نے جو تگ و دو کی ہے اس پر اسے ثواب بھی ملے گا۔ تاہم اپنے اجتہاد کی بنا پر اگر وہ کسی نتیجے پر پہنچے، جب کہ اس بارے میں اسے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے کوئی نص اور واضح ہدایت ہاتھ نہ آئی ہو، تو اس کے لیے یہ کہنا جائز نہیں ہو گا کہ "اللہ تعالیٰ نے یہ چیز حرام کر دی ہے" یا "یہ بات واجب کر دی ہے" یا "فلاں چیز مباح کر دی ہے" یا "یہ اللہ کا حکم ہے"۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں: "امام مالک سے پیش آمدہ بعض نئے مسائل کے بارے میں جب سوال کیا جاتا، تو وہ اپنے اجتہاد سے کام لے کر رائے دیتے ہوئے فرماتے "ہم تو صرف اپنے گمان سے کام لیتے ہیں اور ہمیں اس بارے میں پورا یقین نہیں ہے"۔

فتویٰ دینے میں توقف

امام احمد بن حنبلؒ بعض دفعہ فتویٰ دینے میں توقف کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی کہ یا تو ان کی نظروں میں اس مسئلہ کے بارے میں دلائل متعارض ہوتے، یا صحابہؓ کے مابین اختلاف رائے ہوتا، یا انھیں کسی اثر یا صحابہ اور سلف کے قول کی اطلاع نہ ہوتی۔ وہ اکثر یہ کہہ دیتے کہ "جاؤ جا کر کسی اور سے پوچھ لو"۔ جب کہا جاتا کہ کس سے پوچھیں، تو کہتے علما سے جا کر پوچھ لو۔ وہ کسی متعین شخص کا نام نہ لیتے۔

وہ کسی ایسے مسئلے میں فتویٰ دینے کو انتہائی ناپسند فرماتے، بلکہ منع کرتے، جس کے بارے میں سلف سے کوئی اثر منقول نہ ہوتا۔ انھوں نے اپنے بعض رفقا سے فرمایا تھا کہ "جس مسئلے میں تمھارے لیے کوئی امام نہ ہو اس کے متعلق لب کشائی سے بچو"۔

ابو داؤد کہتے ہیں کہ میں نے جتنی بار امام احمد کو ایسے مسائل میں لاادری (میں نہیں جانتا) کہتے ہوئے سنا جن کے بارے میں علمی طور پر اختلاف ہوتا، اسے میں شمار نہیں کر سکتا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ فتویٰ دینے کے سلسلے میں، میں نے سفیان بن عیینہ سے بہتر کسی کو نہیں پایا: وہ بڑی آسانی سے "لاادری" کہہ دیا کرتے تھے۔

امام احمدؒ کے فرزند عبداللہ کہتے ہیں، میرے والد محترم نے فرمایا کہ شمالی افریقہ کے ایک شخص نے امام مالکؒ سے کسی مسئلے کے متعلق سوال کیا۔ انھوں نے جواب میں "لاادری" کہہ دیا۔ اس شخص نے

تعجب سے کہا "ابو عبداللہ، آپ لا ادری کہتے ہیں؟" امام مالک نے جواب دیا: ہاں، میں لاادری کہتا ہوں۔ جن لوگوں کے پاس تم واپس جاؤ گے، ان سے بھی کہہ دینا کہ میں نہیں جانتا۔

سلف کا فتویٰ دینے سے پرہیز کرنا۔

صحابہ کرام اور تابعین عظام حتی الوسع فتویٰ دینے سے اجتناب کرتے تھے، اور افتا میں جلد بازی کو ناپسند کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی جگہ کوئی اور یہ خدمت سرانجام دے دے۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ مجھے ایک سو بیس صحابہ کرامؓ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، ان میں سے کوئی صاحب خود حدیث سنانا پسند نہ کرتے، بلکہ ان کی یہ خواہش ہوتی کہ کوئی دوسرے صحابی یہ خدمت سرانجام دے دیں۔ اسی طرح ان میں سے کوئی صاحب فتویٰ نہ دیتے، بلکہ ان کی دلی تمنا ہوتی کہ یہ کام ان کا کوئی اور بھائی کر لے۔

امام مالکؒ نقل کرتے ہیں کہ ایک دن عبداللہ بن زبیرؓ اور عاصم بن عمرؓ کے پاس محمد بن ایاسؒ آئے، اور کہنے لگے کہ ایک بدوی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں، اس بارے میں آپ حضرات کیا فرماتے ہیں؟ عبداللہ بن زبیرؓ کہنے لگے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، تم عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ کے پاس جاؤ، میں ابھی ان دونوں کو ام المؤمنین عائشہؓ کے پاس بیٹھا چھوڑ کر آیا ہوں۔ ان سے یہ مسئلہ پوچھ کر پھر ہمیں بھی بتانا۔ معاملہ دونوں حضرات کے پاس گیا، تو بات سن کر، ابن عباسؓ نے ابوہریرہؓ سے فرمایا، تم فتویٰ دو کیونکہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔

امام مالکؒ نے نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا: "ایسا شخص یقیناً دیوانہ ہے جو لوگوں کی طرف سے پوچھے جانے والے تمام مسائل کے بارے میں فتویٰ دیتا رہے۔" انھوں نے مزید فرمایا کہ مجھے عبداللہ ابن مسعودؓ سے بھی اسی قسم کا قول پہنچا ہے۔

سحنون بن عبداللہ کا قول ہے کہ فتویٰ دینے میں سب سے زیادہ جری وہ شخص ہوتا ہے جو سب سے زیادہ کم علم ہوتا ہے۔ ایک شخص کو کسی ایک باب میں یا ایک طرح کے مسائل کا علم ہوتا ہے، اور وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ سارا حق اسی میں ہے۔ انھوں نے مزید کہا: مجھے کچھ مسائل ایسے یاد ہیں جن کے بارے میں آٹھ ائمہ کے آٹھ اقوال ہیں۔ اس بنا پر میرے لیے یہ بات کیسے مناسب ہو سکتی ہے کہ میں چھان بین کر لینے سے پہلے ایک مسئلے کے متعلق فوری طور پر جواب دے دوں۔

(تلخیص و ترتیب نو: خ-م)

ملک غلام علیؒ کی یاد میں

(۱)

قاضی حسین احمد

ملک غلام علی صاحبؒ مولانا مودودیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ آپ اسلامیہ کالج لاہور کے زمانۂ طالب علمی سے مولانا مودودی کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ مولانا مودودی کی شخصیت ہمہ پہلو تھی۔ وہ علمی انہماک کے ساتھ ساتھ عملی سیاسی میدان میں اسلامی انقلاب کے داعی تھے۔ ایک دینی اور سیاسی جماعت کے بانی اور رہنما کے طور پر بھی اپنی جماعت کی نگرانی بھی کرتے تھے، اور عالمی اسلامی تحریک کے قائد کی حیثیت سے پوری دنیا کی اسلامی تحریکیں بھی ان کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتی تھیں۔ ملک صاحب نے مولانا مودودی کی فکر، ان کی سیاسی حکمتِ عملی اور ان کے فہم کو پوری طرح جذب کیا، لیکن اپنے لیے علمی اور فکری میدان کو منتخب کیا اور اس کام میں مولانا کے معاونِ خصوصی بن گئے۔ ملک صاحب نے اپنے فرضِ منصبی کو اس خوبی سے نبھایا کہ ملک صاحبؒ اور مولانا مودودیؒ کے اسلوب اور ان کے طرزِ تحریر میں بھی فرق کرنا مشکل تھا۔ مولانا مودودیؒ کے پائے کی علمی شخصیت اگر کسی کو یہ کہہ دے: ملک صاحب! دکھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ آپ میری طرف سے لکھ کر بھیج دیا کریں، تو اعتماد کی اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔

ملک غلام علیؒ کی طبیعت میں شگفتگی اور لطیف مزاح کی چاشنی تھی جس نے ان کے عاجزانہ انکسار کے ساتھ مل کر ان کی شخصیت کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

میں ۱۹۷۱ء میں افغانستان کے مشہور اسلامی صحافی منہاج الدین گہیز کو لے کر لاہور آیا۔ ان دنوں مولانا صاحبؒ صاحبِ فراش تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں چارپائی پر لیٹے لیٹے انھوں نے منہاج الدین گہیز شہید سے مختصر ملاقات کی۔ گہیز شہید نے مولانا کی صحت کے پیشِ نظر ان کے ساتھ طویل بات چیت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور طے ہوا کہ علمی مسائل میں ملک غلام علی صاحب کی رہنمائی حاصل

کی جائے۔ کمیز صاحب سے ملک صاحب کی طویل علمی گفتگو میں، میں بھی شریک رہا۔ یہ گفتگو ایک جدید اسلامی ریاست میں سیاسی نظام اور خواتین کے دائرہ کار سے متعلق تھی۔ اس ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ علمی مسائل میں ملک صاحب "مولانا مودودیؒ" کے موقف کی پوری پیروی کرتے ہیں۔ اور اپنے فاضل استاد کے موقف کے حق میں دلائل و براہین سے مسلح ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں ملک غلام علی صاحب کے جوان سال بیٹے ملک انعام اللہ، کابل کے شمال میں پروان کے محاذ پر شہید ہو گئے (۱۷ اگست ۱۹۸۹)۔ یہ افغانستان میں سوویت افواج کی مداخلت کا آخری سال تھا۔ ملک صاحب کے پاس میں تعزیت کے لیے گیا تو انھوں نے سعادت مند بیٹے کے بارے میں بتایا کہ تقریباً پانچ سال سے جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تھا۔ ملک صاحب کی بیماری کی اطلاع پر لاہور آیا اور ایک ماہ تک والد صاحب کی خدمت میں رہا۔ جب ملک صاحب صحت یاب ہو کر ہسپتال سے گھر واپس آگئے تو پھر والد محترم کی خدمت میں عرض کی: اب مجھے اپنے کام پر جانے کی اجازت دیجیے۔ والدین کو معلوم ہے کہ خود جہاد پر جانے کی نسبت اولاد کو خندہ پیشانی سے جہاد پر رخصت کرنا اور ان کی شہادت کی خبر کو خندہ پیشانی سے سننا اولیاء اللہ کا کام ہے۔ ملک غلام علی صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ دونوں اس بڑی آزمائش میں کامیاب رہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو قابل رشک ہے اور اس میدان میں ان کے رفقا میں سے ان کے ہم پلہ کم ہی ہیں۔

اپنی اہلیہ کے سامنے جب میں ملک غلام علی صاحب کے صبر و استقامت، ان کی طبیعت کی نرمی اور شیرینی کے پہلو کا ذکر کرتا ہوں تو وہ بتاتی ہیں کہ ملک صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی اس لحاظ سے ملک غلام علی صاحب کی شخصیت ہی کا پرتو نظر آتی ہیں۔ یہ سعادت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہے کہ اہل و عیال بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔ یہ راہِ خدا میں ملک صاحب کے اخلاص اور للہیت کی برکت تھی کہ ان کا پورا ماحول اس رنگ میں رچا بسا تھا۔

ملک غلام علی صاحب آخری وقت تک سمع و اطاعت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز رہے۔ جماعت کی قیادت کی ذمہ داری ہم جیسے کم مایہ لوگوں پر آپڑی۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے سے کم تر آدمی کی اطاعت کرنی پڑے۔ میں عمر تجربے اور علم و فہم کے لحاظ سے ان کے ہم پلہ نہیں تھا، لیکن محض امیر جماعت کے منصب کی وجہ سے انھوں نے مجھے اپنا مکمل تعاون پیش کیا۔ وہ آخر وقت تک جماعت اور امیر جماعت کے ساتھ رہے۔

ملک صاحب نے جوانی کے عالم میں اسلام کو سمجھا۔ اسے دل و جان سے اپنا طریقِ زندگی بنایا۔ زندگی کے آخری لمحے تک دین کی سربلندی کے لیے ایک نظام کی جکڑ بندیوں کو قبول کیا۔ اس نظام کے

اندر اپنی صلاحیتیں اقامت دین کی جدوجہد کے لیے وقف کیں اور کامل اطاعت و وفاداری کی حالت میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ ان کی زندگی اس ارشاد ربانی کے مطابق تھی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ۔ (اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَاجْعَلْهُ مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ)

(۲)

میاں طفیل محمد

مولانا ملک غلام علی صاحب سے میرا تعارف اپریل ۱۹۴۴ میں اس وقت ہوا جب میں وکالت کے بعد ٹھیکیداری، اور ٹھیکیداری کے بعد اپنے ایک رفیق چوہدری محمد انور کے ساتھ شراکت چھوڑ کر مستقل طور پر جماعت کے ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے، نواں کوٹ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ گیا۔ اس سے پہلے میں ملک صاحب اور مرکزِ جماعت کے کسی بھی آدمی کو، سوائے مولانا مودودی صاحب کے، نہیں جانتا تھا۔ دارالاسلام میں مجھے جو رہائشی کوارٹر ملا اس کے ایک طرف ملک غلام علی صاحب، اور دوسری طرف مولانا مودودی صاحب کی والدہ محترمہ، جن کو ہم سب دادی امّاں کہتے تھے، رہتی تھیں۔ ملک غلام علی صاحب سے اگلے کوارٹر میں نعیم صدیقی صاحب رہتے تھے۔

ملک غلام علی صاحب کے ابتدائی حالات، جو میرے علم میں آئے ہیں وہ، یہ ہیں کہ وہ سون سکیسر ضلع شاہ پور کے ایک بااثر معزز اعوان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ پھر وہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں آگئے جہاں انھیں مولانا علم الدین سالک جیسے اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ سالک صاحب نے ملک صاحب کی سنجیدہ اور متین و ذہین طبع کے پیش نظر ان پر خاص توجہ دی اور ان کے ذہن و اخلاق کو سنوارا اور جلا دی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہو گئے۔ وہاں وہ تھرڈ یا فورتھ ایئر میں پڑھتے تھے کہ مولانا مودودی صاحب اسلامیہ کالج میں دینیات کے اعزازی لیکچرر مقرر ہوئے۔ مولانا مودودی صاحب کے ان لیکچروں سے، ملک صاحب اور ان کے متعدد ساتھی، اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ شیخ فقیر حسین مرحوم اور چوہدری غلام جیلانی مرحوم (مدیر و مالک ہفت روزہ ایشیا) بھی مولانا مودودی صاحب کی انھی دنوں کی فتوحات میں سے تھے۔ مولانا مودودی صاحب کے

ان لیکچروں کا شہرہ لاہور کے دوسرے کالجوں میں ہوا تو دوسرے کالجوں کے طلب بھی یہ لیکچر سننے کے لیے آنے لگے۔ چنانچہ کالج کی انتظامیہ نے مولانا کے لیکچر کا انتظام کلاس روم کے بجائے اسلامیہ کالج کے حبیبہ ہال میں شروع کر دیا۔ پنجاب کے انگریز گورنر نے مولانا مودودی صاحب کے تصورِ دین و دینیات سے لاہور کے کالجوں کے طلب کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس نے وزیرِ اعظم پنجاب سکندر حیات خاں کے ذریعہ انجمن حمایت اسلام کے ذمہ داروں پر دباؤ ڈالا کہ وہ مودودی صاحب کا کوئی علاج اور اس صورت حال کا تدارک کریں، جس سے انجمن اور اسلامیہ کالج لاہور کے ذمہ دار سخت پریشان ہو گئے۔ مولانا مودودی صاحب تو یہ خدمت، محض للہ، خدمتِ دین کے طور پر ہی کر رہے تھے، ان کا کوئی ذاتی مفاد تو اس سے وابستہ نہیں تھا۔ اس لیے مولانا مرحوم نے انجمن اور کالج کی انتظامیہ کو پریشان دیکھ کر خود ہی دینیات کی لیکچرر شپ سے استعفیٰ دیا اور ان کی پریشانی کو دُور فرما دیا۔ اسلامیہ کالج سے مولانا مودودی صاحب کی علیحدگی کے بعد ملک غلام علی صاحب بھی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر مولانا کے ساتھ ان کے ہاں آ گئے، اس لیے کہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک انگریز کی تعلیم گاہیں مسلمان نوجوانوں کے لیے تعلیم و تربیت کے ادارے نہیں بلکہ قتل گاہیں تھیں، جہاں ان کو اپنے دین و ثقافت اور ذوق و کردار سب سے بیگانہ و باغی بنانے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ ادارے آزادی اور قیام پاکستان کے بعد اصلاحِ احوال کے بجائے سوگنا بدتر مذبحوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

لاہور میں مولانا مودودی صاحب کے ہاں ملک صاحب کے لیے کوئی کام اور گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے ملک صاحب کو جالندھر میں سید عبدالعزیز شرقی صاحب کے ہاں بھیج دیا گیا، جو غالباً وہاں پریس چلاتے تھے۔ سید عبدالعزیز شرقی صاحب ان چار حضرات میں سے ایک تھے، جنھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی طرف سے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے لیے پہلی پکار پر لبیک کہا تھا۔

جون ۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جاپان کی افواج انڈونیشیا اور سنگاپور وغیرہ کو روندتی ہوئی برما کی مشرقی پاکستان سے ملحق سرحد تک پہنچ گئیں، اور انھوں نے انگریزوں کا، فخرِ برطانیہ کوئین الزبتھ نامی سب سے بڑا جہاز خلیج بنگال میں ڈبو دیا، تو انگریز کو ہندوستان کی بھی فکر لاحق ہو گئی۔ حکومتِ ہند نے بڑے شہروں سے غیر ضروری آبادی کو مضافات میں منتقل ہو جانے کی ہدایت کی، تو مولانا مودودی صاحب بھی اپنے ادارہ ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کے مرکز کے ساتھ اسلامیہ پارک پونچھ روڈ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ چلے گئے۔ ملک غلام علی صاحب بتاتے تھے کہ دارالاسلام پٹھان کوٹ منتقل ہونے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے انھیں جالندھر سے دارالاسلام بلا کر مکتبہ ترجمان القرآن ان کے سپرد کر دیا۔ اور پھر وہ قیام پاکستان کے بعد، مرکزِ جماعت اور رسالہ ترجمان القرآن

کے دفاتر ۳۰ / ۳۱ اگست ۱۹۴۷ کو لاہور منتقل ہونے تک اسی کام پر مامور رہے، اور اپنے فارغ اوقات میں عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں اپنی استعداد بڑھاتے رہے اور مطالعہ میں مولانا کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔

لاہور آنے کے بعد اچھرہ میں جماعت اسلامی اور رسالہ ترجمان القرآن کے دفاتر قائم ہوئے۔ اب مولانا مودودی صاحب جماعتِ اسلامی ہند کے امیر کے بجائے صرف امیرِ جماعتِ اسلامی پاکستان رہ گئے تھے۔ ہندوستان کی جماعتِ اسلامی ہم سے الگ ہو کر جماعتِ اسلامی ہند یا بھارت بن گئی تھی، اور اس نے مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب کو اپنا امیر بنالیا۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ سے پاکستان آنے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے ملک غلام علی صاحب کو مکتبہ سے نکال کر اپنا خصوصی معاون بنالیا۔ اس وقت سے مولانا مرحوم کے آخری لمحۂ حیات تک ملک صاحب اسی منصب پر فائز رہے۔ اس طرح سے میں اور ملک غلام علی صاحب اپریل ۱۹۴۴ سے ملک صاحب کے آخری یوم حیات تک دارالاسلام، اچھرہ اور منصورہ میں یکجا اور اکٹھے جماعت اسلامی کے ہمہ وقتی کارکن چلے آئے ہیں۔ اس درمیان میں ۱۹۸۱ سے ۱۹۸۴ تک ملک صاحب پاکستان کی شریعت کورٹ کے جج کی حیثیت سے اسلام آباد میں رہے۔ ان چار سالوں کے سوا اور کوئی وقفہ ہماری رفاقت میں نہیں آیا۔

مولانا ملک غلام علی صاحب نے بھی مولانا مودودیؒ کی طرح کسی یونیورسٹی یا دارالعلوم سے رسماً علم حاصل نہیں کیا۔ مولانا موصوف کی محبت و رفاقت اور اپنی ذاتی محنت و کوشش اور ریاضت سے علم حاصل کیا اور وہ علم و فضل اور فقاہت کے بلند ترین مرتبہ پر جا پہنچے۔ اس سلسلے میں ان کے علم و فقاہت کا اندازہ ان کے شریعت کورٹ پاکستان کے جج کی حیثیت سے صادر کردہ فیصلوں، رسائل و مسائل جلد ششم اور ہفتم، اور خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا علمی جائزہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ علم و تقویٰ کے میدان میں، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علاوہ، مولانا مودودیؒ کا ہم پلہ اگر کوئی شخص تھا، تو وہ ملک غلام علی مرحوم ہی تھے اور میرے نزدیک تو مولانا مودودی کا علم و فضل ملک صاحب کے ساتھ دفن ہو گیا ہے۔ اب اس پائے کا صاحبِ علم کوئی شخص ہمارے درمیان نہیں رہا ہے۔ اللہ رب العالمین ہی کی ذات پاک ہے کہ وہ اس خلا کو پُر کرنے کی کسی کو توفیق عطا فرما دے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

جماعتِ اسلامی کی صفوں میں جو چند حضرات، صحابہ کا نمونہ اور ان کے نقشِ پا تھے، ان میں ملک غلام علی مرحوم گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ملک غلام علی صاحب کی عالمانہ ذمہ داری اور دیانت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں ملک صاحب ہی مولانا کے نام آنے والے سوالات، استفسارات و مسائل کے جوابات تحریر فرماتے اور

ان کو مولانا مرحوم کے سامنے پیش کرتے۔ ان میں مولانا جن جوابات میں کوئی اصلاح و تبدیلی یا رد و بدل فرماتے ان سب کو تو ملک صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے منسوب اور ان کے نام سے شائع کیا ہے اور جن کو بہ جنسہٖ رہنے دیا اور یا جن کا جواب ملک صاحب نے مولانا مرحوم کے بعد خود ہی دیا ہے، ان سب کو اپنے نام سے شائع کیا۔ اس طرح سے ملک غلام علی صاحب کے غیر مطبوعہ رسائل و مسائل کی ایک دو جلدیں اور مرتب ہو کر شائع ہوں گی' ان شاء اللہ۔

ملک غلام علی صاحب اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے انتہائی منکسرالمزاج، سراپا اخلاص و تواضع، کم سخن، خلق محمدی کے آئینہ دار اور اپنی ہی سوچوں میں غرق رہنے والے تھے۔ میری پچاس سالہ رفاقت کے دوران، میں نے کبھی ان کو کسی سے لڑتے جھگڑتے تو درکنار بلند آواز سے کلام کرتے بھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ کبھی کسی دوسرے کے کام میں دراندازی یا مداخلت نہیں کی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک رہے۔ جو کام بھی مولانا مرحوم یا جماعت نے ان کے سپرد کیا اسے پورے انہماک سے انجام دینے میں لگ گئے یا پھر اپنے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انھوں نے کبھی کسی معاملے میں مولانا مودودی صاحب یا مجھ سے اختلاف کیا، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔

(۳)

خلیل احمد حامدی

ملک غلام علی مرحوم، جن کا انتقال ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ء کو منصورہ میں ہو گیا ہے، مولانا مودودیؒ کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ موصوف ۱۹۲۰ء میں سون سکیسر میں پیدا ہوئے۔ یہ خالصتاً دیہاتی معاشرہ تھا، جہاں علم و تہذیب کے افق تو محدود ہوتے ہیں، مگر کچھ ایسی خوبیاں بھی اس میں پائی جاتی ہیں جو آیندہ چل کر تہذیب و علم کے لیے اچھی بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً طبیعت میں سادگی، قناعت، احترام باہمی، اہل علم کا اکرام اور دین کی اساسی اقدار کے ساتھ محبت و وابستگی۔ ملک صاحب ان تمام محاسن کو جلو میں لیے شہر میں داخل ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات خود ان کی زبان سے سن لیں:

"میرا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ میرے والد بہت دیندار تھے۔ تہجد گزار تھے، وہ اپنی حد تک نماز، روزہ اور نیکی کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ مجھے بچپن ہی سے تعلیم کا بہت شوق

تھا، اور میں سکول میں اچھے طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ پرائمری سے آگے تک ہر جماعت میں اچھے نتیجے کی بنا پر مجھے وظیفہ ملتا رہا۔ گاؤں کے بزرگ بتاتے تھے کہ گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی طالب علم کو وظیفہ ملا ہو۔" (قومی ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۸۰ء)

والدین کی ابتدائی تربیت انسان کی فطرت پر گہرے نقوش مرتسم کر دیتی ہے۔ ملک صاحب کے اندر اس تربیت کے آثار و معالم ملنے والوں کو پہلی ملاقات میں نظر آجاتے تھے۔ علی الخصوص دو باتیں؛ سادگی اور تدین۔ یہ دونوں باتیں انسانی سیرت کے اعلیٰ ترین جوہر سمجھی جاتی ہیں، اور جس انسان کے مقدر میں علم و دعوت کی وادیوں میں مراحل شوق طے کرنا لکھا ہو وہ ان جواہر کے بغیر یہ مراحل عبور نہیں کر سکتا۔

لاہور میں آمد

دیہاتی زندگی کی ان خوبیوں کو لیے ہوئے ملک صاحب شہر کی فضا میں آگئے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارے علاقے میں نوشہرہ مرکزی قصبہ ہے۔ جہاں تھانہ، سول ہسپتال اور ہائی سکول ہے۔ میں اسی سکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ تعلیم کا انتظام اور معیار وہاں اچھا نہ تھا۔ میرے ایک بڑے شفیق استاد تھے جو وہاں پڑھاتے تھے، لاہور کے رہنے والے تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ اگر کوئی ایسی صورت بن جائے کہ لاہور جا کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکوں تو بہت مناسب ہو گا۔ انھوں نے بھی میری تجویز پسند فرمائی۔ ان کا نام مولانا عبدالغفور تھا۔ حویلی کابلی مل میں ان کا مکان تھا۔ بہت نیک اور دیندار تھے۔ بی۔اے، بی۔ایڈ تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ان شاء اللہ تمھارا انتظام کرا دوں گا۔ چنانچہ شیرانوالہ اسلامیہ ہائی سکول میں جو انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام چل رہا تھا انھوں نے مجھے داخل کرا دیا، اور سکول کا سب سے اچھا جو سیکشن تھا، وہ مجھے دلوایا"۔ (ایضاً)

یوں ملک صاحب یکایک سون سکیسر کی سادہ و محدود فضاؤں سے نکل کر لاہور جیسے شہر میں اوائل عمر میں ہی آگئے۔ اس نئے ماحول میں ہر چیز ان کے لیے نئی ہو گی، تعلیم کے میدان میں باہم مسابقت ہو رہی ہو گی، ملکی اور غیر ملکی مسائل پر سیاسی بحثیں ہوتی ہوں گی۔ ظواہر تمدن نئے نئے پیکر میں سامنے آ رہے ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت شامل حال نہ ہو تو یہ چیزیں انسان کو راہ راست سے منحرف بھی کر سکتی ہیں، مگر ملک صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی اپنی سابقہ اچھائیاں محفوظ رکھنے اور ان اچھائیوں میں مزید ترقی کرنے کے مواقع فراہم کر دیے۔ فرماتے ہیں: "شیرانوالہ اسلامیہ ہائی سکول میں

یہ طریق کار یہ تھا کہ جب نماز کا وقت ہوتا، تو تمام اساتذہ اپنے اپنے طالب علموں کو ساتھ لے کر مسجد میں خود بھی نماز پڑھتے اور اپنے شاگردوں کو بھی پڑھاتے۔ بعض لڑکے یہ کہتے کہ چونکہ شیرانوالہ مسجد قریب ہے ہم تو وہیں نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ میں مولانا احمد علی صاحب کے درسوں اور خطبوں سے مستفید ہوتا رہا، ان کے پیچھے نماز پڑھتا رہا، اور میں نے ان کی مسجد کی صفیں بہت گھسائیں۔ اس زمانے میں درس، پند و نصیحت وغیرہ سب کچھ ہوتا تھا، ماحول کافی حد تک دینی اور اسلامی ہوتا تھا۔" (ایضاً)

کالج کے ایام

سکول کی زندگی سے فارغ ہو کر ملک صاحب کالج کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس دور میں کالجوں کے اندر انگریزی نظامِ تعلیم پوری قوت کے ساتھ رائج تھا۔ اس نظامِ تعلیم میں مادہ پرستی کا اس حد تک درس دیا جاتا رہا ہے کہ اسلامی عقائد و اخلاق کی جڑیں ہل جاتی تھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی نظامِ تعلیم سے مسلمانوں کے اندر الحاد و دہریت کو بڑا رواج ملا، اور اس کے نتیجے میں مسلمان نوجوانوں کے اندر طرح طرح کے غیر اسلامی افکار و نظریات در آنے لگے۔ ادب، تاریخ، معاشرت، معیشت اور سیاست، غرض ہر میدان میں فکری انتشار نے جنم لیا۔ یہاں بھی ملک صاحب اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص سے بہرہ مند رہے، اور انھیں ایسے اساتذہ کا سایہ حاصل رہا جو انھیں خوب سے خوب تر بننے میں مدد دیتے رہے۔ ملک صاحب نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں انھیں جو اساتذہ ملے ان میں ایک مولانا علم الدین سالک مرحوم تھے، جن سے ملک صاحب نے فارسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔ سالک مرحوم کی دیندارانہ طبیعت کے بارے میں ملک صاحب فرماتے ہیں: "یہ ناممکن تھا کہ ان کی کلاس میں کوئی شاگرد ننگے سر بیٹھے۔ ہر طالب علم ٹوپی لے کر آتا تھا، دوسرے پیریڈوں میں دابے رکھتا یا کہیں رکھ دیتا، لیکن فارسی کے پیریڈ میں اسے لازماً ٹوپی پہننا ہوتی تھی۔ اگر قمیص کا کوئی بٹن کھلا ہوتا تو وہ اعتراض کرتے اور کہتے بٹن بند کرو، اور اگر کسی کا سر ننگا ہوتا تو وہ پوچھتے "تمھارا نام کیا ہے؟" اگر جواب میں کوئی کہتا، "جی میرا نام غلام علی ہے یا غلام محمد، تو فرماتے: "نہیں نہیں، تمھارا بپتسمہ کس گرجے میں ہوا ہے؟ تمھارا مسیحی نام کیا ہے؟" (ایضاً)

اس طریقِ تربیت پر آج کل کے ماہرین نفسیات طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کی تربیت جس طرح اصلاحِ باطن کے لیے ضروری ہے، اسی طرح اصلاحِ ظاہر کے لیے بھی ضروری ہے۔ ظاہری اصلاح کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔

مولانا علم الدین سالک مرحوم کے علاوہ ملک صاحب کو کالج کی زندگی میں دوسرے بھی قابلِ قدر اساتذہ ملے، جنھوں نے ان کی فطری صلاحیت، دینی ذوق اور جستجوئے حق کے محرکات کو دبانے کے بجائے مزید اجاگر کیا۔ اور پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی کالج میں مولانا مودودیؒ کچھ عرصہ کے لیے پہنچ گئے اور ملک صاحب کا ان سے رابطہ ہو گیا۔

میرے نزدیک حالات و واقعات کا یہ تسلسل اتفاقات کی قبیل سے نہیں ہے، بلکہ جستجوئے حق رکھنے والے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ حق آسان کرنے کے لیے جو "توفیق" دی جاتی ہے وہی ان تمام واقعات کے پیچھے کار فرما ہے۔

مولانا مودودیؒ کی شاگردی میں

مولانا مودودیؒ کی اسلامیہ کالج سے وابستگی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ملک صاحب فرماتے ہیں:

"ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا مودودیؒ صاحب اب دینیات پڑھایا کریں گے۔ مولانا سے پہلے ٹونک کے مولانا عمر خان ہمیں دینیات پڑھاتے تھے۔ بڑے نیک اور بااصول آدمی تھے۔ وہ ضعیف ہو چکے تھے اور ان کی جگہ مولانا مودودیؒ تشریف لائے۔ مولانا سے جب انجمن کے حکام نے بات چیت کی تو مولانا نے فرمایا: "میں اعزازی طور پر کام کروں گا، کوئی معاوضہ نہ لوں گا۔ میرے کام میں، طرزِ تعلیم میں آپ کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے، کوئی قدغن نہ لگائیں گے، کوئی خاص گائیڈ لائنز (رہنما اصول) نہ دیں گے۔ میں خود ایک مصروف آدمی ہوں، لیکن بہرحال آپ نے پیش کش کی ہے، میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا، اور یوں نوجوان تعلیم یافتہ نسل تک میری آواز پہنچ جائے گی۔" (ایضاً)

اس مشروط معاہدے کے بعد، مولانا مودودیؒ نے اسلامیہ کالج میں اسلامیات کا مضمون پڑھانا شروع کر دیا۔ مولانا کے پاس وقت کم ہوتا تھا اور ہر کلاس میں جا کر لیکچر دینا مشکل تھا۔ اس لیے ان کے مشورے کے مطابق تمام طلبہ کو ایک ہال میں جمع کر لیا جاتا، اور وہ بیک وقت سب کو لیکچر دیتے۔ ملک صاحب فرماتے ہیں: "یہاں مولانا کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ اس وقت ان کے بال بالکل سیاہ تھے۔ ٹوپی کالی پہنتے تھے، کبھی کبھی رومی ٹوپی بھی پہنے ہوتے تھے۔"

مولانا اپنے لیکچروں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی تشریح کرتے، اور بتاتے کہ اسلام محض پوجا پاٹ کا یا فقط عبادات کا دین نہیں ہے، بلکہ یہ عبادات تو دراصل ہمیں ایک بڑی عبادت کے لیے تیار کرتی ہیں، اور یہ عبادت پوری زندگی پر محیط ہے۔ اسلام کا ایک وسیع اور ہمہ گیر اجتماعی نظام ہے، جو زندگی کے

ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں سیاست بھی ہے، معیشت بھی، معاشرت بھی، غرض ہر چیز اس کے دائرے میں آتی ہے، سیاست بھی اس سے خارج نہیں ہے۔

مولانا کے اس اندازِ تعلیم اور تشریحِ دین سے کالج کے اربابِ اختیار کچھ پریشان ہوئے۔ یہ تشریح انسان کو انسان کی غلامی سے نجات حاصل کرنے، اور طاغوتی نظام کو پاش پاش کر کے دنیا کے اندر دینِ حق کو غالب کرنے کی دعوت تھی۔ اس دعوت نے ہر دَور میں اربابِ اختیار و اقتدار کو پریشان کیا ہے۔ جس زمانے میں مولانا اسلامیہ کالج کے اندر دین کی یہ تشریح نوجوان نسل کے سامنے کر رہے تھے، وہ انگریزوں کا دَور تھا، اور انگریز حکمرانوں سے کالج کو گرانٹ ملتی تھی۔ اس لیے انجمن کے اربابِ اختیار نے محسوس کیا کہ مولانا کا طرزِ تعلیم انھیں مہنگا پڑے گا۔ انھوں نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ "دینیات" تک اپنے کام کو محدود رکھیں۔ مولانا محترم کو یہ حدود و قیود پسند نہ تھیں۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کی تقریروں سے یہ لوگ خدشات میں مبتلا ہو گئے ہیں تو انھوں نے خود ہی بڑھ کر اس سلسلے کو ختم کر دیا۔

مولانا مودودیؒ سے وابستگی

ملک صاحب کا رابطہ مولانا مودودیؒ سے قائم ہو چکا تھا، بلکہ ملک صاحب کے بقول: "مولانا کی ایک آدھ تقریر سن کر ہم تو دل ہی دے بیٹھے۔"

مولانا نے جب کالج چھوڑ دیا، تو ملک صاحب نے بھی تعلیم بیچ میں چھوڑ دی، اور مولانا کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ یہ وابستگی جذباتی و اندھی عقیدت پر مبنی نہ تھی، بلکہ ملک صاحب نے شعوری طور پر مولانا کے پیغام کو سمجھا، ان سے بحثیں کیں، اور بھرپور شرحِ صدر و طمانیتِ قلب کے ساتھ مولانا کے شریکِ سفر ہو گئے۔ ملک صاحب کے بعض اساتذہ نے انھیں اس اقدام سے اپنی صوابدید کے مطابق روکنے کی کوشش کی، مگر ملک صاحب دل اور شعور دونوں کے ہاتھوں جو فیصلہ کر چکے تھے، وہ اٹل تھا، اور مشیتِ الٰہی اس کے پیچھے کار فرما تھی۔

تعلیم کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد ملک صاحب نے اقامتِ دین کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ ان کی زندگی میں یہ ایک ایسا بنیادی انقلاب تھا جسے سرسری سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نوجوان طالب علم، جو اپنے والدین کی ہزاروں تمناؤں کا مرکز ہو اور جسے خود بھی دنیاوی لحاظ سے اپنے روشن مستقبل کی کرنیں نظر آ رہی ہوں، اگر کوئی ایسا فیصلہ کرتا ہے کہ اس سے نہ والدین کی آرزوئیں بروئے

کار آئیں اور نہ ذاتی امنگوں کی تکمیل کی گنجایش رہے، تو یہ فیصلہ یقیناً کسی بالاتر ایمانی قوت کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقامتِ دین کے اعلیٰ و ارفع نصب العین کو سمجھ کر ملک صاحب مولانا کی خدمت میں آئے، اور کہنے لگے: "میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ مسلمان کے کرنے کا یہی کام ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہرحال مسلمان کو کسی ایسے کام کا مکلف نہیں ٹھہرایا جو ناممکن العمل ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں یا نہیں۔"

اس کے جواب میں مولانا نے بھی اس جوہرِ قابل کے سامنے اس موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا، وہ ان کی داعیانہ شان کا نہایت اہم گوشہ وا کرتا ہے: "بہرحال مسلمان کے کرنے کا یہی کام ہے۔ بطور مسلمان انفرادی حیثیت سے اور اجتماعی حیثیت سے ہمارے ذمے یہی کام ہے کہ ہم دنیا کے اندر اسلام کی دعوت کو پھیلائیں اور دین کی اقامت کریں، خواہ کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو۔ نتائج تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ بہت سے انبیا گزرے ہیں کہ کسی کو ایک مقتدی ملا، کسی کو دو۔ قیامت کے روز بعض انبیا تشریف لائیں گے تو انکے ساتھ ایک ایک، دو دو، ساتھی ہوں گے۔ بعض کے تو گھر والوں نے بھی ساتھ نہ دیا۔ اس لیے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ خدا کے فضل سے کروڑوں مسلمان موجود ہیں، اگر وہ چاہیں تو کیوں انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔"

مولانا مرحوم کے اس پُر سوز اور جذبہ انگیز جواب کے بعد ملک صاحب نے اپنے جس ردِّعمل کا اظہار کیا وہ بھی کیا خوب ہے۔ ملک صاحب نے کہا: "ہرچہ یادا باد ما کشتی در آب انداختیم، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نوجوان ہوں، میری کوئی زیادہ دینی تعلیم بھی نہیں، ویسے میں بالکل ہی کورا بھی نہیں ہوں۔ بہرحال میں آپ کے ساتھ ہوں، میں اپنی زندگی کو اس مقصد کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتا ہوں"۔ (ایضاً)۔

ثابت قدمی و استقامت

اس انقلابی فیصلے کے بعد ملک صاحب نے تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا۔ جیسا کہ پیچھے عرض کر آیا ہوں کہ ملک صاحب نے جب تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا، تو ان کے نہایت قابلِ قدر اساتذہ نے انھیں بہت سمجھایا کہ یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے، تعلیم کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچانا دانش مندانہ اقدام نہیں ہے۔ مگر ملک صاحب اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے، اور ان دانشوروں کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ ملک صاحب نے جذبات کی رَو میں بہہ کر یہ کام کیا تھا۔ ملک صاحب کا یہ فیصلہ پورے شعور پر مبنی تھا، اور مستقبل نے بتا دیا کہ

جس فیصلے کو لوگ نقصِ تعلیم پر محمول کرتے رہے، وہ ملک صاحب کے لیے نہ صرف ترقی تعلیم بلکہ ترقی عمل کا بھی موجب ہوا۔

اب ملک صاحب نے مکمل طور پر مولانا کی مصاحبت اختیار کرلی۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنے گھر والوں پر بوجھ ڈالنے کے بجائے لاہور کے اندر ہی ٹیوشن پڑھا کر گزر اوقات کا انتظام کیا، اور پھر باقی وقت مولانا کے ساتھ ان کے مختلف کاموں میں شامل رہے۔ ٹیوشن پڑھانے کا پیشہ بھی ملک صاحب کو پسند نہ آیا، اس لیے کہ یہ کام بھی اسی نظامِ تعلیم کی یک گونہ خدمت تھی جو ملک میں رائج تھا اور جس سے انگریزی سامراج کو تقویت مل رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے یہ کام چھوڑ دیا اور پھر خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ گئے۔ مولانا مودودیؒ، ملک صاحب کے اس فیصلہ پر خاصے متفکر ہوئے کہ اب کیا ہو گا، کیونکہ خود مولانا بھی نہایت محدود دنیا میں رہ رہے تھے اور ان کے پاس بھی کوئی ایسا کام نہیں تھا جو ملک صاحب کے لیے ذریعہ معاش بن سکتا۔ خود ملک صاحب بھی بغیر کام کیے مولانا پر بوجھ بننا نہیں چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ انھوں نے مولانا کو تفکر میں ڈال دیا ہے، مگر انھوں نے مولانا کا تفکر یہ کہہ کر دُور کردیا: "اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا، وہ مسبب الاسباب ہے۔"

یہ جملہ ہے تو نہایت سادہ اور مختصر، مگر یہ اس تعلیم کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جو مولانا مودودیؒ بیسویں صدی کے مادہ پرست انسان کو دے رہے تھے۔

جالندھر میں "جنسِ نایاب" کی ترویج

ملک صاحب کی نئی صورت حال کے پیش نظر، مولانا نے اپنے ایک دوست عبدالعزیز شرقی صاحب کو جالندھر خط لکھا کہ وہ اس صالح نوجوان کے لیے کوئی کام نکالیں۔ شرقی صاحب نے ملک صاحب کو جالندھر بلا لیا، اور وہاں ایک چھوٹا سا مکتبہ کھول کر ان کے سپرد کردیا۔ اس مکتبہ کی کیا حالت تھی، اس کا اندازہ اس ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے جو ملک صاحب نے مکتبہ کے بورڈ پر خود لکھوا دیا تھا۔

جنس ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں حالی نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ

اس سوز و ساز اور پیچ و تاب میں موصوف کے لیل و نہار گزرتے رہے۔ دکان سے کوئی آمدنی نہ تھی، معاش کی راہیں مسدود تھیں۔ ایسی آزمائشوں سے بہت کم انسان کامیاب ہو کر نکلتے ہیں، سوائے ان خوش قسمت لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا فیضان خاص فرماتا ہے۔ ملک صاحب بھی ان

معدودے چند لوگوں میں تھے۔

جماعت کے تاسیسی اجتماع میں شرکت

۱۹۴۱ میں جب مولانا نے تشکیل جماعت کا ارادہ کیا، تو جن ہم خیال لوگوں کو خطوط لکھ کر لاہور بلوایا، ان میں ملک صاحب بھی تھے۔ ملک صاحب جالندھر سے اس اجتماع میں شرکت کے لیے آئے۔ اسی اجتماع میں جماعت اسلامی کی تاسیس کا فیصلہ ہوا۔ اس لحاظ سے ملک صاحب ان ارکان جماعت میں سے ایک تھے جنھیں جماعت اسلامی کے السابقون الاولون کا لقب دیا جا سکتا ہے۔

دارالاسلام میں قیام

تاسیس جماعت کے بعد جب مولانا دوبارہ دارالاسلام پٹھان کوٹ جا بیٹھے، تو ملک صاحب کو جالندھر سے اپنے پاس بلوا لیا اور مکتبہ جماعت اسلامی کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ ملک صاحب مکتبہ جماعت اسلامی کے ناظم تھے، مگر خود ہی کتابیں پیک کرتے تھے، پھر خود ہی انھیں حوالہ ڈاک کرتے۔ ایک عالم سرمستی میں وہ اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔ نہ دنیاوی فخر کی تلاش، نہ مال و دولت کی حرص، اور نہ اپنی غریبی پر کوئی ملال۔

ملک صاحب فطری طور پر علم جُو انسان تھے۔ دارالاسلام میں انھیں علمی ماحول بھی میسر آگیا۔ اس ماحول کے بارے میں ان کے تاثرات ملاحظہ ہوں: "اس جگہ میرا جی لگ گیا۔ وہ ایسا ماحول تھا کہ ہمیں دوبارہ نصیب نہ ہو سکا۔ وہاں ہماری اپنی ایک بستی تھی، اپنی فضا تھی۔ بہت ہی باقاعدگی سے درس قرآن اور درسِ حدیث ہوتا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب درسِ قرآن دیتے تھے، اور مولانا مودودیؒ صاحب درسِ حدیث۔ پوری مشکوٰۃ مولانا نے وہاں پڑھائی اور درس دیا... دارالاسلام کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ ہر کام ہم خود کرتے تھے۔ پانی خود بھرنا، لکڑیاں خود کاٹ کر لانا، رات کو اپنی حفاظت خود کرنا۔"

اس زمانے میں ملک صاحب نے عربی زبان میں اپنی قابلیت کو ترقی دی۔ جب آرام اور تفریح کا وقت ہوتا تو وہ دارالاسلام کے قرب میں بہنے والی نہر، اپر باری دوآب، کے کنارے جا بیٹھتے، اور عربی قواعد و انشا کی مشق میں منہمک ہو جاتے۔ آغاز میں قیامِ لاہور کے زمانے ہی میں انھوں نے عربی زبان سیکھنے کا آغاز کر دیا تھا، مگر اس میں ترقی دارالاسلام کے زمانے میں ہوئی۔ ملک صاحب علم و فضل کی جس

مسند پر فروزاں ہوئے، اس کے پیچھے وہی جہدِ مسلسل کار فرما ہے جو ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔

مولانا مرحوم کے معاونِ خصوصی

تقسیم ملک کے بعد دار الاسلام کا پورا قافلہ لاہور آگیا۔ یہاں لکھنے کی ذمہ داری کے بجائے مولانا مرحوم نے اس گوہر کی یوں قدر افزائی فرمائی کہ اپنا معاونِ خصوصی رکھ لیا، اور یوں بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف کی علمی فضا میں انھیں منتقل کر دیا۔ اب ملک صاحب کے لیے میدانِ علم میں ترقی درجات کے دروازے کھل گئے۔ ان دروازوں کو کھولنے میں جہاں مولانا کی توجہ نے کام کیا، وہاں خود ملک صاحب کے صدق و اخلاق اور ورع و پارسائی نے بھی انھیں قدم قدم پر سہارا دیا۔ فیضِ استاد اور اخلاصِ شاگرد دونوں عناصر اشہبِ علم کے سوار کو فضائے بسیط میں اڑاتے رہے۔ ملک صاحب آخر دم تک مولانا مرحوم کے معاونِ خصوصی رہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ اس علمی کام کے ساتھ ساتھ ملک صاحب ایک کارکن کی حیثیت سے تحریک کی دیگر خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ مثلاً مختلف مساجد میں خطبہ جمعہ، تربیت گاہوں میں تقاریر اور درس وغیرہ۔

ملک صاحب سے خاکسار کا براہِ راست تعارف اور رابطہ مارچ ۱۹۵۵ میں ہوا، جب خاکسار دار العروبہ میں آیا۔ اس وقت ملک صاحب معاونِ خصوصی کے منصب پر تھے۔ دار العروبہ اور ملک صاحب کا شعبہ استفسارات، دونوں کا تعلق براہِ راست مولانا مرحوم سے تھا۔ کام کے لحاظ سے بھی دونوں میں مشابہت تھی۔ ایک کا تعلق اندرونِ پاکستان اور دوسرے کا بیرونِ پاکستان سے تھا۔ چنانچہ یہ دونوں شعبے سالہا سال تک دوش بدوش چلتے رہے۔ کسی انسان کو سمجھنے کے لیے اتنا قربُ بہت کافی ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ خاکسار اور ملک صاحب کم از کم چودہ سال اچھرہ میں ہمسائے رہے ہیں۔ دونوں گھروں کے درمیان میں ایک معمولی سی دیوار حائل تھی۔ اس طویل ہمسائگی کا خلاصہ اگر بیان کروں تو یہ کہوں گا کہ "ایک مرنجان مرنج ہمسایہ۔"

علمی مرتبہ و مقام

ملک صاحب علمی لحاظ سے ایک جامع شخصیت تھے۔ گو انھوں نے اپنی کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی، مگر انگریزی زبان میں انھیں بڑی دسترس حاصل رہی۔ وہ انگریزی لٹریچر کا وسیع مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ اس بنا پر انھیں معاصر دنیا کے حالات اور فکری تحریکات سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ مولانا

مرحوم کی انگریزی خط و کتابت میں ملک صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ اس باب میں ملک صاحب کو جو قدرت حاصل تھی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب مرحوم انگریزی میں جو کچھ لکھتے رہے، اس پر نظرثانی وہ باصرار ملک صاحب سے کراتے رہے۔ علی الخصوص "لائف آف محمدؐ" اور قرآن کریم اور صحیح مسلم کے انگریزی ترجمے ملک صاحب کی نظر سے گزرے ہوئے ہیں۔ ان کے انگریزی سے اردو تراجم بھی زبان و بیان پر کامل قدرت اور مہارت کے آئینہ دار ہیں۔

عربی زبان میں تو ملک صاحب عصامی (خود ساز) تھے۔ جدید و قدیم دونوں قسموں کے عربی لٹریچر میں درک حاصل تھا، فقہ و حدیث کے دقیق ترین مضامین اور پیچیدہ ترین مقامات پر ملک صاحب کو جو عبور حاصل تھا وہ پاکستان میں اقل قلیل لوگوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ فقہ میں عام مسائل سے لے کر عائلی احکام، معاملات اور مغازی و سیر کے وہ مباحث جو دینی درسگاہوں میں بھی کم ہی پڑھائے جاتے ہیں، ملک صاحب کو ازبر تھے۔ یہ علمی ذخیرہ کسی باقاعدہ درسگاہ کا فیض نہیں تھا بلکہ ان کے ذاتی مطالعے اور مولانا مرحوم کے ساتھ روزمرہ کے مسائل میں شرکت کی بدولت حاصل ہوا تھا۔

یوں تو ملک صاحب کی متعدد تحریریں تحقیق و استدلال کے لحاظ سے بڑا اونچا پایہ رکھتی ہیں، مگر ان کی علمی گہرائی کا سب سے اعلیٰ ثبوت ان کی شاہکار تصنیف "خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا علمی جائزہ" ہے۔ اس میں آپ انھیں ایک فقیہ و محدث بھی دیکھ سکتے ہیں اور مورخ اور ماہرِ سیاستِ اسلامی بھی۔ نیز رسائل و مسائل حصہ ششم اور حصہ ہفتم بھی ملک صاحب کے فقہی درک کے عمدہ نمونے ہیں۔

جدید عربی لٹریچر پر بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ دورِ جدید کے شامی عالم ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم کے سنت کے موضوع پر مقالات (جو "سنتِ رسولؐ" کے نام سے چھپ چکے ہیں) اور مصر کے اخوانی رہنما عبدالقادر عودہ شہید کی کتاب الاسلام و اوضاعنا القانونیہ کا اردو ترجمہ (اسلام کا نظام قانون) ملک صاحب کی عربی دانی کی بہترین مثال ہے۔

اردو زبان میں بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں نہایت شستہ اسلوب عطا فرمایا تھا۔ ان کے اسلوب میں خود مولانا مرحوم کے انداز کی جھلک ملتی ہے۔ مولانا مرحوم کی تحریریں دو محاسن کا آئینہ ہیں۔ ایک عمدگی بیان اور دوسرا قوتِ استدلال۔ یہ دونوں باتیں آپ ملک صاحب کی تحریر میں بڑی حد تک دیکھ سکتے ہیں۔ درحقیقت ملک صاحب نے مولانا سے اکتسابِ فیض میں یہ کمال کر دکھایا ہے کہ متعدد تحریروں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ صحبتِ گل نے یہ گل کھلائے ہیں۔

شخصیت

ذاتی اوصاف و خصائل میں اسلاف کی جھلک ملتی تھی۔ سراپا تواضع تھے، خودستائی نام کو بھی نہیں۔ مزاج میں انتہائی خاکساری، گفتگو میں نرمی، بے ضرورت گفتگو سے پرہیز، محفل میں تچی تلی بات کرنے پر اکتفا، لباس اور رہن سہن میں انتہائی سادگی، علم بے پایاں تھا مگر غرورِ علم سے پاک، جستجو و طلب میں بے باک اور زبان پر یہی ایک لفظ کہ میں تو طالب علم ہوں۔

موصوف ۱۹۸۱ میں صدر پاکستان کے ذاتی انتخاب پر وفاقی شرعی عدالت کے جج مقرر ہوئے۔ چار سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۸۵ میں عدالت سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ میں حسبِ سابق علمی مہمات میں مشغول رہے، اور دمِ واپسیں تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ وفات سے دو روز قبل تک وہ دفتر آتے رہے۔ خاکسار نے ان سے اپیل کی کہ وہ گھر پر ہی آرام کیا کریں، دفتر آنے کی زحمت نہ کریں، مگر انھوں نے جواب دیا کہ دفتر آنے سے دوستوں اور ملنے والوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان کا جسم تو شوگر کے مرض نے کھوکھلا کر دیا تھا، مگر ان کی روح توانا، ان کا ذہن بیدار اور ان کا دل پُرسوز تھا۔ اس باطنی قوت کے بل پر وہ اپنے ناتواں جسم کے ساتھ کشاں کشاں دفتر آ جاتے اور دفتر کی رونق میں اضافہ ہو جاتا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ کی صبح وہ انتہائی کمزور ہو گئے۔ انھیں منصورہ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ساڑھے تین بجے تک وہ عیادت کے لیے آنے والوں سے آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے۔ پھر یکایک دل کا دورہ پڑ گیا، اور پلک جھپکنے میں ملک صاحب نے ساتھیوں کو الوداع کہہ دیا۔ رات ۱۰ بجے تفقہ و بصیرت، صدق و اخلاص اور مکارمِ اخلاق کا یہ چمکتا ہوا تارہ ...منوں مٹی کے اندر اتار دیا گیا۔ مگر۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

عصری مسائل

آبادی

بھوک اور غربت کا مسئلہ یا ترقی کا زینہ

مسلم سجاد

قاہرہ کانفرنس کے حوالے سے عالمی سیاست، عقاید و اخلاق اور تہذیب و ثقافت کے بنیادی مسائل پر جو گفتگو ہو رہی ہے اس کا ایک پہلو معاشی اور اقتصادی ہے۔ اسی پہلو پر ہمارے جیسے ملکوں میں حکومتوں کی سرپرستی میں بہبود آبادی کے عنوان سے، خاندانی منصوبہ بندی، یعنی ضبطِ ولادت اور منع حمل کی مہم کا مدار ہے۔ اس مہم کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ کھانے والے منہ زیادہ آجائیں گے، تو وہ ترقی کی ساری کوششوں کو کھا جائیں گے۔ جن کے کھانے کے لیے غذا ہی نہ ہو، انھیں دنیا میں لانا حماقت اور ظلم نہیں تو کیا ہے۔ خوشحالی کا نسخہ یہی ہے کہ دو سے زائد بچے ہرگز نہ پیدا کیے جائیں۔ نہایت مہارت و چابکدستی کے ساتھ، متنوع ذرائع ابلاغ سے زبردست اشتہاری مہم کے ذریعہ تسلسل سے، خواندہ اور ناخواندہ، عوام و خواص، سب کے ذہنوں پر یہ منطق ٹھونسی جا رہی ہے۔ اور کیونکہ غربت سے سب ہی تنگ ہیں، اس لیے عوام اپنی سادگی میں یہ سوچنے لگے ہیں کہ کہیں ان کے بچے ہی تو ان کی غربت کی وجہ نہیں ہیں۔ غربت کی حقیقت اور اس پراپیگنڈہ کی شدت کے سامنے اللہ تعالیٰ کے رزّاق ہونے کے عقیدہ اور اس مہم کے خلاف دین کی بنیاد پر دیے جانے والے دلائل کے باوجود ان میں سے بعض کے پاس ہتھیار ڈال دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

لیکن حقیقت حال کیا ہے؟ کیا واقعی غربت اور غذا کی عدم فراہمی کی وجہ آبادی میں اضافہ ہے؟

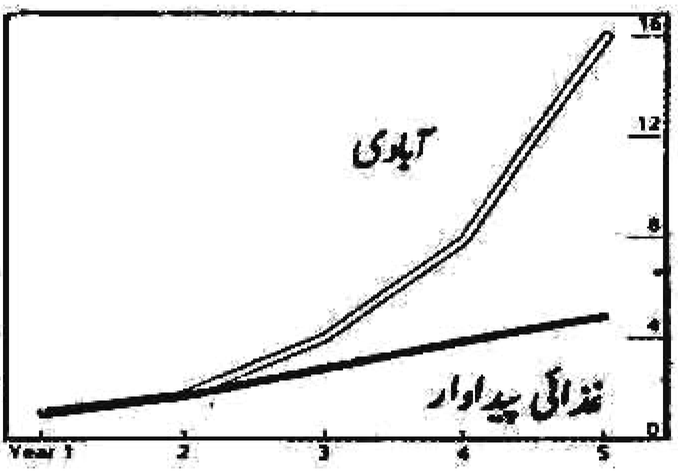
اس پوری فکر کی بنیاد تھامس مالتھس کا وہ نظریہ ہے، جو اس نے دو سو سال قبل ۱۷۹۸ء میں اپنے مقالہ "Essay on the principle of population" (اصول آبادی) میں پیش کیا۔ اس نے کہا تھا کہ غذا میں اضافہ ہر سال ایک ہی متعین مقدار میں (۱۔ ۲۔ ۳ کی رفتار سے) ہوتا ہے، جب کہ آبادی میں دن دونا رات چوگنا (۲۔ ۴۔ ۸۔ ۱۶ کے حساب سے) پھلا نگیں لگاتا ہے۔ اس حساب سے جلد ہی وہ

وقت آئے گا کہ سطح ارض پر کھڑے ہونے کی جگہ نہ رہے گی۔ لوگ فاقے کریں گے، بھوکے رہیں گے، قحط پڑیں گے، انسان ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑیں گے۔

اس کے جواب میں بہت کچھ کہا گیا ہے، لیکن ایمان اور عقیدہ کی بنیاد پر جو بات کہی جائے، مغرب کے فرمودات پر "آمنا و صدقنا" کہنے والوں کے لیے اس میں کوئی وزن نہیں۔ ان کے لیے تو مغرب ہی سے کوئی "نص" لائی جائے تو وہ اپنی رائے سے رجوع کریں۔

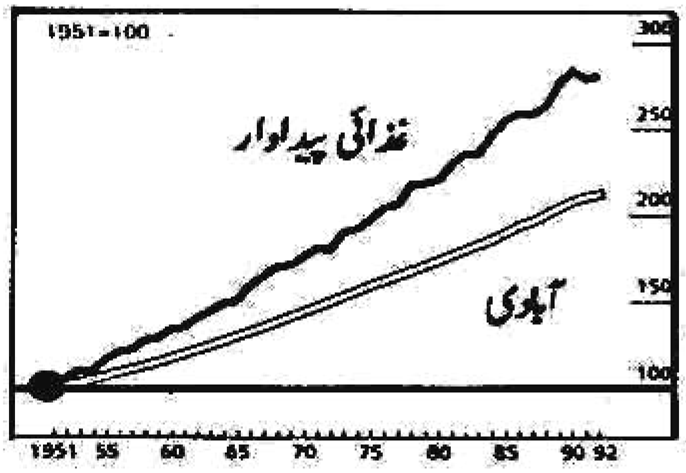
برطانیہ کے وقیع رسالہ اکنامسٹ (۳-۹ ستمبر ۱۹۹۴) نے جسے ایک کالم نگار نے "مغرب کا دماغ" قرار دیا ہے، مالتھس کے نظریہ کو بوگس شماریاتی پیش گوئی One of the first exercises in bogus statistical extrapolation قرار دیا ہے۔ زرعی پیداوار میں انقلاب نے اس کے نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے لیکن دنیا اب بھی اس کے پیدا کردہ خدشات سے نجات نہیں پا سکی ہے (ص ۱۴) وہ لکھتا ہے: "مالتھس کے وقت سے اب تک دنیا کی آبادی میں چھ گنا اضافہ ہوا ہے لیکن غذائی پیداوار کم ہو جانے کے بجائے اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے بڑھی ہے۔ حد یہ ہے کہ پیداوار میں

افسانہ ......



مالتھس کی پیش گوئی

...... حقیقت



عالمی غذائی پیداوار اور آبادی

زیادتی کے بحران سے نمٹنے کے لیے کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں۔ لیکن (بیچارے) ماہرین معاشیات مسلسل پریشان ہیں۔ غذائی قلت سے سامنا پیش نہ آیا تو انھوں نے یہ مسئلہ اٹھا دیا کہ کیا سرمایہ کاری نئے کارکنوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے کفایت کرے گی۔ جب روزگار بھی فراہم ہوتے رہے تو انھوں نے شور کیا کہ سرمایہ کی فراہمی میں اضافہ اتنا سست رفتار ہو گا کہ معیار زندگی میں بہتری رونما

ہو گی۔ جب معیارِ زندگی بہتر ہو تا رہا تو انھوں نے پیشین گوئی کی کہ قدرتی وسائل ختم ہو جائیں گے۔ جب قدرتی وسائل ختم ہونے میں نہ آئے تو انھوں نے کہا کہ بڑھتی ہوئی آبادی سے ماحول کو نقصان پہنچے گا۔ اب بات اس نکتہ پر مرکوز ہے۔" (ص ۱۴)

اس وقت دنیا کی آبادی ۵ ارب ۷۰ کروڑ ہے۔ ہر سال تقریباً ۹ کروڑ ۴۰ لاکھ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اضافہ آبادی کے جو مختلف تخمینے ہیں، ان کے مطابق ۲۰۵۰ میں یہ تعداد تقریباً ۸ ارب، ۱۰ ارب یا ۱۲ ارب ہو سکتی ہے۔

کیا کرۂ ارض اتنی آبادی کو غذا فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ ماضی میں تو زمین نے انسان کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ یقیناً مستقبل میں بھی ایسا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ رزق کے خزانے... چلیے، اس دلیل کو رہنے دیتے ہیں۔

Population and Development Review (جائزہ آبادی و ترقی) کے جون ۱۹۹۴ کے شمارہ میں مینیٹوبا (Manitoba) یونیورسٹی کے پروفیسر واکلیو سمل (Vaclav Smail) نے لکھا ہے:

"جس طرح آج تک غذائی پیداوار میں اضافہ کی رفتار آبادی میں اضافہ کی رفتار سے تیز تر رہی ہے، ایک طویل عرصہ تک یہی صورت برقرار رہنے کے امکانات ہیں۔ دنیا تو وافر خوراک پیدا کرتی ہے۔ اگر غریبوں کے پاس خریدنے کے لیے رقم نہ ہو، یا یہ ان تک نہ پہنچے، تو یہ مختلف مسائل ہیں۔ مستقبل میں زیادہ افراد کو غذا فراہم کرنے کے لیے چند آسان تدابیر ہی سے پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قیمتوں کے درست تعین، بہتر تکنیک کے استعمال اور تھوڑی سی تعلیم سے ہی ۳ ارب مزید افراد کی غذائی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ ۲۰ فیصد مزید زمین کو زیرِ کاشت لا کر فی ایکڑ پیداوار میں ۳۵ فیصد اضافہ کر کے، اور چند معمولی تبدیلیاں لا کر ۲۰۵۰ تک ۲ سے ڈھائی ارب تک مزید افراد کو غذا فراہم کی جا سکتی ہے۔ اس تخمینہ میں مصنوعی کھاد اور جراثیم کش ادویات جیسی نو دریافت تدابیر کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے، جنھوں نے گذشتہ ۶۰ سال میں زراعت کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ یقیناً انسان کا جدت طراز ذہن آیندہ ۶۰ سال میں ایک یا دو نئی انقلابی تدبیریں ضرور دریافت کر کے عمل میں لائے گا"۔

یہ اظہار خیال کسی مولوی یا مُلّا کی جانب سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ مغربی دنیا کا اپنے میدان کا ماہر ایک شخص کر رہا ہے۔ دوسری طرف خود اقوام متحدہ کی آبادی فنڈ کی ۱۹۹۴ کی رپورٹ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ آیندہ صدی کے وسط تک ۱۰ ارب افراد کو غذا کی فراہمی ناممکن نہیں ہے۔ یہ رپورٹ عالمی سطح پر غذا کی کمی کے خوف کو بالکلیہ مسترد کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے حکمرانوں کو جو سبق پڑھایا گیا ہے، اس

کے مطابق وہ نیم عوام کالانعام کو یہی بتا رہے ہیں کہ جیسے سارے مسائل کی جڑ اور ان کی ساری ترقیاتی کوششوں کو ملیامیٹ کرنے والے یہ کم بخت بچے ہیں جو چلے ہی چلے آ رہے ہیں اور موجود لوگوں کی پُر آسایش زندگی میں حارج ہو رہے ہیں۔

یہ پروپیگنڈا بھی بڑی دھوم دھام سے کیا گیا ہے، اور ہمارے حکمران بھی ہمیں یہی باور کروا رہے ہیں کہ ملک میں غربت کی اصل وجہ اضافہ آبادی ہے۔ غربت یقیناً ایک بہت بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے اور اسے دُور ہونا چاہیے۔ لیکن کیا آبادی کم کرنے سے غربت دُور ہو جائے گی؟ تجربات اور اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو گا۔ غربت کثرت آبادی کا نتیجہ نہیں ہے، اس کے بہت سے دیگر عوامل ہیں، اور صرف آبادی کم کرنے سے خوشحالی نہیں آ جائے گی۔

کیا تیز رفتار آبادی والے ملک کے خوشحال ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں؟ یہ کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ افریقہ کے بعض ممالک، جہاں شرح پیدائش سب سے زیادہ ہے، معاشی طور پر سب سے زیادہ بدحال ہیں۔ لیکن جہاں اس سے یہ دلیل لائی جا سکتی ہے کہ زیادہ شرح پیدائش کی وجہ سے غربت زیادہ ہوتی ہے، وہاں اتنی ہی قوی یہ دلیل بھی لائی جا سکتی ہے کہ دراصل زیادہ غربت کی وجہ سے شرح پیدائش زیادہ ہوتی ہے۔

زمین پر جگہ کی کمی ہے، نہ وسائل کی۔ غربت کی وجوہات کچھ اور ہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ تین صدیوں میں جہاں تیز رفتاری سے معاشی ترقی ہوئی، وہاں اتنی ہی تیز رفتاری سے آبادی میں اضافہ ہوا ہے۔ اسی کانفرنس کے حوالے سے مغرب کے ایک اور ترجمان، امریکہ کے ہفتہ وار، نیوزویک (۱۲ ستمبر ۱۹۹۴) نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۴ کے بعد سے آبادی میں غیر معمولی اضافہ (boom) ہوا ہے اور اسی دَور میں دنیا نے انتہائی غیر معمولی وسیع اقتصادی ترقی دیکھی ہے۔ زرعی پیداوار اس حد تک بڑھ گئی کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ تقسیم کا نظام بہتر ہونے سے قحط پڑنا بھی بہت کم ہو گئے ہیں۔ (ص - ۱۲)

عام طور پر اقتصادی ترقی آبادی میں اضافہ کے ساتھ ہی ہوئی ہے۔ یورپ، امریکہ اور ایشیا، ہر جگہ یہی تجربہ ہوا ہے۔ بہت سے ممالک میں آمدنیاں بھی زیادہ ہیں اور اضافہ آبادی کی شرح بھی زیادہ ہے۔ مثلاً الجیریا، اردن، مراکش، وینزویلا اور میکسیکو وغیرہ۔ آج کوئی بھی صاحب علم یہ تسلیم نہیں کرتا کہ غذائی قلت کا سبب آبادی میں اضافہ ہے۔ امریکی ماہر معاشیات پال سیموئلسن (Paul Samuelson) نے تیس سال قبل خطرات کا اندیشہ ظاہر کرنے والوں کو چیلنج کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ اضافہ آبادی کل آبادی میں نوجوانوں کے تناسب کو بڑھانے کی وجہ سے خوشحالی کا سبب ہوتا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سرمایہ کاری پر اس کے کوئی منفی اثرات نہیں ہوتے، بلکہ یہ ترقی کی ناگزیر ضروریات، تعلیم اور صحت

پر زیادہ سرمایہ کاری کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔

آبادی میں زیادتی یعنی overpopulation سے کیا مراد لی جائے۔ اس کا اتنا چرچا ہے کہ کوئی اس کے حقیقی تصوّر کے بارے میں نہیں سوچتا۔ آپ اس کی کوئی تعریف کریں، ایسی متعدد مثالیں مل جائیں گی جن میں یہ تعریف پورا نہیں اترتی۔ کیا تیز رفتار (rapid) شرح اور overpopulation ایک ہی بات ہیں۔ کیا اس کا تعلق شرح پیدائش (birth rate) سے ہے۔ کیا اس کا تعلق محدود علاقوں میں زیادہ گنجان آبادی سے ہے۔ جب امریکی نائب صدر نے افریقہ کے ملک روانڈا کے مسائل پر بات کرتے ہوئے اس کی آبادی کی طرف توجہ دلائی تو وہیکن نے جواب دیا کہ اس سے زیادہ گنجان آباد ملک جاپان ہے، لیکن وہاں لوگ ایک دوسرے کو قتل نہیں کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آبادی کا مسئلہ واضح نہیں ہے۔ جب لوگ اس کی بات کرتے ہیں تو عموماً ان کی مراد غربت کے مسئلہ سے ہوتی ہے۔ مگر ان دونوں میں کوئی حقیقی ربط نہیں ہے۔

برطانیہ کے اخبار سنڈے ٹائمز نے آبادی کے مطالعات کے ہارورڈ کالج کے پروفیسر نکولس ایبرشاٹ (Nicholas Eberstadt) کا ایک مضمون (five great myths that thwart the experts arthematics) کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ پانچ افسانوی مفروضے جنھیں عموماً صحیح جان کر پالیسیاں بنائی جاتی ہیں، غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ قاہرہ کانفرنس کے لائحہ عمل کے مطابق خاندانی منصوبہ بندی کے لیے بین الاقوامی مدد چار گنا کر دی جائے گی (پاکستان نے تو اپنا حصہ خوشی خوشی وصول کرنا بھی شروع کر دیا ہے) اور دنیا کی حکومتیں ہمارا پیسہ اور اپنا وقت ضائع کرنا شروع کر دیں گی۔ یہ پانچ مفروضے یہ ہیں۔

۱۔ آبادی میں اضافہ کی تعداد کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

۲۔ آبادی میں اضافہ کا اثر انسانی بہبود پر ناخوشگوار ہوتا ہے۔

۳۔ تیسری دنیا میں وضع حمل کی جدید تدابیر عام کرنے کی ابھی بہت گنجایش ہے۔

۴۔ وضع حمل کی تدابیر عام کرنے سے شرح پیدائش میں کمی واقع ہوتی ہے

۵۔ زبردستی اور جبر کے بغیر بھی آبادی میں اضافہ کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

مصنف نے پانچوں امور پر گفتگو کر کے ان کا غیر حقیقی ہونا ثابت کیا ہے۔ رضاکارانہ خاندانی منصوبہ بندی اور سرکاری اہداف میں کوئی ربط ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ چین کی طرح ریاستی جبر شروع ہو جاتا ہے اور پھر لڑکیوں کو قتل کرنے کی نوبت آ جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں منصوبہ بندی کی مہم چلانے والے دوسرے ملکوں میں اس کے نتائج دیکھ رہے

ہیں لیکن مغربی استعمار اپنے وسیع تر مفادات کے تحت ترقی پذیر ملکوں میں آبادی کم کرنے کی جس پالیسی کو چلانا چاہ رہا ہے، اس کے آلۂ کار بن رہے ہیں۔ اس مہم کے اخلاقی مفاسد، زیر بحث نہیں۔ اس کے ذریعے ترقی کے پھل سب تک پہنچانے اور خوشحالی کا دَور لانے کے سب دعوے اور وعدے بھی جھوٹے ہیں۔ اقتصادی ترقی کے لیے کسی دوسرے ہی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔

مسئلہ کا اصل حل ایک معقول معاشی پالیسی اور آگے بڑھ کر سرگرمِ کار ہونے والوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ دنیا موجودہ سے بہت زیادہ آبادی کی ضروریات پورا کر سکتی ہے۔ اور زیادہ افراد بہتر صورتِ حال پیدا کر سکتے ہیں۔ More might even be better (نیوز ویک، ص ۔ ۱۳)

یہ ایک مثبت نقطۂ نظر ہے۔ ہر آنے والا اپنے ساتھ بہت کچھ لاتا ہے۔ حکومت کا اور معاشرہ کا فرض یہ ہے کہ اپنے وسائل انھیں مفید شہری بنانے میں استعمال کرے۔ ملک کا نظام اس طرح ترتیب دیا جائے کہ عدل کی بنا پر سب کو ان کے حقوق ملیں۔ تعلیم و ترقی کے یکساں مواقع ملیں تو آبادی تو کسی ملک و قوم کا اصل خزانہ ہے۔ نادان اور ناسمجھ ہیں جو اس خزانے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور عوام میں منفی نقطۂ نظر رائج کر رہے ہیں۔

اگر ہم اپنے ملک کی مثال لیں تو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارا مسئلہ اضافۂ آبادی نہیں، ایک ایسی قیادت کا فقدان ہے جو محض محبِ وطن ہونے ہی کے حوالے سے سہی، تعمیری پالیسیاں اختیار کرے۔ بدعنوانیاں، ترقیاتی منصوبوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ عام آدمی کی کمائی کے اربوں روپے چند منظورِ نظر لوگوں میں بنکوں کے قرضے کے ذریعے بطور عطیہ تقسیم ہو رہے ہیں۔ غربت دُور ہو تو کیسے۔

کیا ملک میں دولت کی کمی ہے؟ حال ہی میں پی آئی اے کے دو جہاز خریدنے کے لیے محض تھوڑے سے بظاہر یقینی منافع کی خاطر ۳ ارب مانگنے پر ۱۸ ارب روپے حاضر کر دیے گئے۔ اگر کوئی مخلص اور دیانت دار قیادت عوام کے لیے نمونہ پیش کر کے صحیح رویوں کی آبیاری کرے تو ملک میں وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہمارے لیے شرم کی بات ہے کہ اپنے پرائمری گرلز اسکولوں کی چار دیواری کے لیے ورلڈ بنک سے قرضہ لے کر آیندہ نسلوں کو گروی رکھنے کے لیے تیار ہیں لیکن اتنے معمولی کاموں کے لیے اپنے صاحبِ ثروت افراد کو متحرک کرنے کا نہیں سوچتے۔ قوموں کی تعمیر، سب مِل جُل کر کرتے ہیں۔ جب عوام، ملک و قوم کا درد رکھنے والوں کو اپنا قاید منتخب کریں گے، تو ایک پُرعزم اجتماعی کوشش سے، اضافہ آبادی میں کمی کی مہم چلائے بغیر ایک ایک فرد کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے، ملک کے نہ صرف معاشی، بلکہ دیگر مسائل بھی حل کیے جا سکتے ہیں۔

آبادی کم کرنے کی تحریک میں وہ مفاد پرست پیش پیش ہیں، جن کے مفادات اس سے متعلق منصوبوں اور سرگرمیوں سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ ہمارے جیسے ملک میں غربت دور کرنے اور خوشحالی لانے کے لیے تعمیری اور مثبت منصوبہ بندی کرنا چاہیے، اور آبادی کی منصوبہ بندی کی قومی مہم کو بالکلیہ ترک کر دینا چاہیے، جس پر اب تک ۵ ارب روپے خرچ کیے جا چکے ہیں۔ سب وسائل تعمیر و ترقی میں لگائے جائیں۔ بدعنوانیاں اور شاہ خرچیاں ختم کی جائیں۔ ہر فرد کو ایک قیمتی خزانہ سمجھ کر اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔ پھر پاکستان کو تو اپنے نظریۂ حیات کی اتنی زبردست طاقت اور مدد حاصل ہے کہ کوئی بھی قیادت اس سے مخلص ہو، تو عوام کا خوشدلانہ تعاون حاصل کر سکتی ہے۔ اسلامی نظم معیشت کے اصول اور عملی تدابیر واضح ہیں۔ ضرورت ہے کہ کوئی قوم اس پر مکمل عمل کر کے دنیا میں بھی خوشحالی اور طمانیت کے منظر دکھائے اور آخرت میں بھی سُرخرو ہو۔ وقت آگیا ہے کہ عوام اپنا بُرا بھلا سوچیں اور دیکھیں کہ وہ اپنا مستقبل کن افراد کے سپرد کرتے ہیں۔ ملک کے مسائل، بشمول غربت، کوئی مخلص اور پُرعزم قیادت ہی حل کر سکتی ہے، آبادی منصوبہ بندی کی شکست خوردہ تحریک چلانے والی قیادت نہیں۔

رسائل و مسائل

معلّمی کا پیشہ اختیار کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "احیائے اسلام اور معلّم" پڑھ کر حقیقی معلّم بننے کے لیے بے تاب ہوں، لیکن ارد گرد اساتذہ کا کردار دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔ رہنمائی چاہتا ہوں؟

کوئی انسان خامیوں سے پاک نہیں ہو سکتا، نہ سب انسان ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ ہر اجتماعی گروہ میں بہت اچھے لوگ بھی مل جائیں گے، ان سے بہت کم درجے کے بھی۔ آپ چند آدمیوں کو دیکھ کر بحیثیت مجموعی تمام گروہ کے بارہ میں کوئی تاثر قائم کر لیں، کوئی رائے بنا لیں، یا کوئی فتویٰ دے دیں، تو یہ صحیح نہ ہو گا۔ دیکھنا چاہیے کہ بحیثیت مجموعی یہ گروہ کیسا ہے؟ جو افراد مجھے خراب لگتے ہیں وہ صرف معیارِ مطلوب سے نیچے ہیں اور چند خامیوں کا شکار ہیں، یا پورے بگڑ چکے ہیں۔ ہم سب میں خرابیاں ہیں، ہم بھی اپنی ۲۴ گھنٹہ کی زندگی سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی اپنے کو الاؤنس دیتے ہیں، استغفار کرتے ہیں، اور اصلاح کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہمیں دوسروں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ مایوس ہرگز نہ ہونا چاہیے، اپنے سے زیادہ الاؤنس دوسروں کو دینا چاہیے، ان کے لیے استغفار کرنا چاہیے، ان کی اصلاح بھی حکمت سے کرنا چاہیے۔

نفسِ امارہ کو نفسِ لوّامہ کے تابع کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

مسئلہ بہت سیدھا ہے۔ اس کا جواب بھی آسان ہے، عمل بھی آسان۔ انسان خود اسے مشکل بنا لیتا ہے۔ نفسِ لوّامہ، نفسِ امّارہ اور نفسِ مطمئنہ کی اصطلاحات کا چکر چھوڑ دیجیے، قرآن و حدیث کی روشنی میں غور کیجیے۔

انسان کے نفس میں نیکی اور بدی دونوں کے میلانات ہیں۔ یہ میلانات اس آزمائش کے لیے ضروری ہیں، جس کی خاطر وہ زمین پر بھیجا گیا۔ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (تاکہ اللہ آزمائے کہ تم میں سے کون حسن عمل کرتا ہے)۔ اپنے اختیار سے بدی سے رک جائیں اور نیکی کریں، یہی امتحان ہے۔ نیکی اور بدی کے درمیان کشمکش مسلسل اور مستقل ہے۔ یہ موت سے پہلے ختم نہ ہو گی، لیکن اس وقت

امتحان بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ بدی کا رجحان ختم ہو جائے یا بالکل مغلوب ہو جائے۔

کسی کو بھی انسان پر یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اس سے زبردستی برائی کرائے۔ اپنا نفس بھی وسوسہ پیدا کرتا ہے، برائی کا خیال ڈالتا ہے۔ شیطان بھی یہی کرتا ہے، انسان بھی، مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ انسان خود اپنے اختیار سے بدی کرتا ہے۔ اگر اختیار سے نہیں کرتا، بلکہ مجبور ہے، تو مواخذہ بھی نہیں۔ یہی امارہ بالسوء ہے۔

اس کا علاج بہت آسان ہے۔ اللہ کو یاد رکھنا۔ اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (بے شک اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں)۔ ہر نعمت کو، ہر ملنے والی چیز کو، ہر مصیبت کو اس کی طرف سے دیکھنا۔ ہر سبب کے پیچھے رب کو دیکھنا۔ اس سے ملاقات کو یاد رکھنا، آپ اس نسخہ پر عمل کریں، جتنا کر سکیں۔ یہی نسخہ ہے نفسِ امارہ بالسوء کو قابو میں رکھنے کا، اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی ضمانت نہیں کہ نفس مغلوب ہو گا، گناہ نہ ہوں گے، آپ غافل نہ ہو جائیں گے، کبھی خواہشات کی دلدل میں نہ پھنس جائیں گے۔ اس کا علاج بھی یہی ہے: فوراً اللہ کو یاد کرنا اور استغفار کرنا۔ اس کی یاد کے نور سے ساری تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ اللہ آپ کی مدد کرے۔

رک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے اور یہ کہ یہ ناقابلِ معافی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

بندہ گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کرتا، اپنا نقصان کرتا ہے۔ اگر ساری مخلوق متقی ترین ہو جائے تو اس کی خدائی میں کوئی اضافہ نہ ہو گا۔ اگر سب بدترین گناہ گار بن جائیں تو اس کی خدائی میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ ظلم کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز یا عمل کو وہ مقام دیا جائے جس کا وہ مستحق نہیں۔ شرک کرنے والا اپنے نفس کو غیر اللہ کا عبد بناتا ہے، غیر اللہ کو اللہ کا مقام دیتا ہے۔ اللہ کے عظیم شان و مقام میں ہی کرتا ہے، اس لیے وہ ظلمِ عظیم ہے۔ بندہ پر اللہ کا حق ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کرے۔ یہ ایک لامتناہی حق ہے اور لامتناہی حق کو تلف کرنے کی سزا لامتناہی ہی ہو سکتی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

کیا آپ میری مدد فرمائیں گے؟ اک بندے کی تلاش کے سلسلے میں، کہ اللہ تعالیٰ، جس کا ہاتھ بن گیا ہو، جس کا پاؤں بن گیا ہو، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے، تو کیا انگلی رکھ کر کسی مخصوص شخص کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ، ہاں یہ ہے وہ شخص۔ اس کی دوسری توجیہ کیا ہو سکتی ہے۔

ایسے لوگ یقیناً پائے جانے چاہییں، اور پائے جاتے ہیں، جن پر وہ حدیث قدسی صادق آتی ہے کہ، میں ان کا ہاتھ بن جاتا ہوں، پاؤں بن جاتا ہوں۔ لیکن کیوں کہ یہ کوئی دینی منصب نہیں، قربِ الٰہی کا

ایک درجہ اور مقام ہے، اس لیے ایسے آدمیوں کی نشان دہی انگلی رکھ کر کرنا، صرف ظن و تخمین پر مبنی ہو گا۔ یہ نہ مناسب ہے نہ ممکن۔ اس میں بہت فتنوں کے امکانات بھی ہیں۔

حدیث کا مقصد ایسے لوگوں کی نامزدگی کی جستجو کرنا نہیں، خود ویسا بننے کے لیے کوشاں رہنے کی ترغیب دینا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی فکر کرے، اور جو اس مطلوب معیار کے قریب بھلے لوگ نظر آئیں، ان سے دوستی و محبت کا رشتہ استوار کرے۔

کافی دفعہ آپ کی گفتگو اور تحریروں سے استفادہ کیا، اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے بہت مفید پایا۔ اسی لیے آپ سے مخاطب ہوں۔ امید ہے شفقت سے متوجہ ہوں گے۔ کیا اقامت دین یا تحریک اسلامی کے کام کے سلسلے میں وقت اور فرصت کے لحاظ سے ناموزوں اور ایمان و تقویٰ کے لحاظ سے متصادم، ذریعہ روزگار ترک کرنا درست ہو گا، جبکہ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ روزگار بھی نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور کم ہمتی کا تصور تو نہ ہو گا؟ میں کافی عرصہ سے بے روزگار ہوں۔ کیا اسے اپنے اللہ کی طرف سے عملوں کی ابتلا یا سرزنش جانوں یا تقدیر کا نوشتہ سمجھ کر قبول کر لوں؟ کیا ان معاملات میں انسان کو قدرت حاصل ہے کہ اپنے پلاننگ اور بہتر کام سے انھیں بدل سکے۔

۱۔ فقر و افلاس، انسان کو کفر تک لے جا سکتا ہے۔ اس لیے میری دانست میں جب تک متبادل حلال ذریعہ معاش کا معقول امکان نہ ہو، آپ غلط روزگار ترک نہ کریں، اِلّا یہ کہ اپنے حالات، استقامت اور امکانات کو دیکھتے ہوئے آپ اپنے اندر ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کی صلاحیت اور عزیمت پاتے ہوں۔ بعض جیّد علما کا فتویٰ یہی ہے۔

ہاں، جب تک ذریعہ معاش غلط رہے، دل میں اس کی خلش رہے، اس پر ندامت رہے، اس پر استغفار کریں، اور اس کو چھوڑنے کے لیے کوشاں بھی رہیں۔ کسی لمحہ بھی اس کو خوش گواری سے برداشت کرنا شروع نہ کر دیں۔

۲۔ مصیبت ہو یا نعمت، یہ اللہ کی جانب سے آزمایش ہے، اور حیاتِ اُخروی میں فوز و فلاح کا ذریعہ۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کا معاملہ بھی خوب ہے۔ نعمت ملتی ہے تو شکر کرتا ہے، اور مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتا ہے۔ آپ اپنی بیروزگاری کو نہ اعمال کی پاداش سمجھیں، نہ نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیں۔ سعی ضروری ہے، اس لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں۔ اور جو نوشتۂ تقدیر ہے، اس سے صبر کی کیفیت حاصل کرتے رہیں۔

۳۔ پلاننگ اور کوشش بھی نوشتۂ تقدیر ہے۔ اسباب ظاہری کے استعمال سے ہی نتائج نکلتے ہیں، اِلّا

ماشاء اللہ۔

کافی عرصہ سے یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ذہنی اشکالات کو کسی کے سامنے رکھا جائے۔ اور ذہنی و قلبی اطمینان حاصل کیا جائے

جماعت کا رکن ہونے کے باوجود، اس وقت جماعت کا کام کرنے کو قطعاً بھی دل نہیں چاہ رہا۔ حالیہ شکست نے دل کو بری طرح زخمی کیا۔ یہ زخم تو بھر جاتے، تنظیمی دراڑوں نے ارادوں میں مزید شگاف پیدا کر دیا ہے۔ رہی سہی کسر مقام اور حلقہ کی سست، مُردہ اور روایت پسند قیادت اور بوجھل تنظیم نکال دیتی ہے۔ لگتا ہے سارے جذبات سرد خانے کے نذر ہو گئے ہیں۔ ایک گہری مایوسی نے ہر چار جانب اپنا سایہ کیا ہوا ہے۔ ذہن میں سوالات گھومتے رہتے ہیں کہ کیا جماعت کی قیادت (ہر سطح کی) مقامی قیادت بن سکتی ہے؟ کیا جماعت پچاس سال کی جدوجہد کے بعد آگے کی طرف بڑھی ہے؟ کیا کام کے اس انداز کے ذریعے اسلامی انقلاب ہمارے ملک میں دستک دے سکے گا؟ مختلف دنیوی حاجات مثلاً روزگار، صحت اور تعلیم وغیرہ کے لیے قرآنی اور غیر قرآنی دعاؤں کا اہتمام کیا حیثیت رکھتا ہے۔ آیا یہ طرز حضور اکرمؐ اور صحابہؓ سے ثابت ہے؟

۱۔ مایوسی ایک زبردست وسوسہ ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے، وہ ہے اعتصام باللہ اور اللہ کی پناہ۔ دلائل کے انبار سے بھی وساوس کے تار و پود نہیں ٹوٹتے۔ رب الناس، ملک الناس، الٰہ الناس کی پناہ میں آتے ہی سارے وساوس کے تاریک سائے چھٹ جاتے ہیں، کہ وہ نور السمٰوٰت والارض ہے۔ وسوسہ کیا ہے؟ ایک خیال --- تحریک کا کام کیوں کروں، یہ دل میں اٹھنے والی سوچ ہے۔ جو سوالات آپ کے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا جواب ممکن ہے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ جواب آپ کے لیے شافی ہو۔ جب دائیں بائیں، آگے پیچھے سے شیطان حملہ آور ہو رہا ہو، تو اس کے خلاف سب سے مضبوط دفاع اور سب سے کارگر حملہ، یادِ الٰہی ہے۔ آپ یہ سوچیں کہ کیا دعوت اِلی اللہ اور اقامت دین کے لیے جدوجہد، اللہ نے میرے اوپر فرض کی ہے؟ آپ کا دل مطمئن ہو، تو فرض کی ادائگی میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ قیادت کیسی ہے، وقت کتنا لگے گا۔

آپ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کیا پوچھے گا۔ کیا یہ کہ تمھاری قیادت مثالی کیوں نہ تھی؟ کیا یہ کہ ۵۰ سال میں بھی کامیابی کے آثار کیوں نمودار نہ ہوئے؟ یا یہ کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو تم نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کہاں تک لگایا؟

آپ کے سارے احساسات صحیح بھی ہوں، تو بھی آپ کے پاس اپنے رب کے لیے عذر ہونا

چاہیے کہ میں نے اپنی سی کوشش کر لی تھی۔ یہ جواب، اور اس کے صلہ میں جنت، اس کے علاوہ آپ کو اور کیا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان فطری طور پر ان چیزوں سے مایوس ہوتا ہے جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ لیکن اس مایوسی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیے جانا ہی آپ کی اصل آزمایش ہے۔ امید نہ اپنے کام سے ہونا چاہیے، نہ حالات سے، بلکہ صرف اللہ سے۔ وہ چشم زدن میں حالات بدل سکتا ہے۔ اللہ کی رحمت سے جو مایوس ہوتا ہے وہ صحیح راہ سے بھٹک جاتا ہے۔

۲۔ ہم تو سرتاسر اللہ تعالیٰ کے آگے فقیر اور محتاج ہیں۔ دل کا ایک بار پھر دھڑکنا، اگلی سانس کا آنا، یہ سب اس کی مشیت پر منحصر ہے۔ توحید کی روح یہی ہے۔ اور اس لیے ہر چیز، دینی ہو یا دنیوی، صرف اللہ سے مانگنا چاہیے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جوتے کا تسمہ بھی اسی سے مانگو۔ صحت اور معاش تو بہت اہم چیزیں ہیں۔ حضورؐ نے بے شمار دعاؤں میں سب کچھ اللہ سے مانگنے کا طریقہ بھی سکھایا ہے، اور الفاظ بھی۔ امراض کے نام لے لے کر ان سے پناہ طلب کی ہے۔ شفا کی دعائیں تعلیم دی ہیں۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (جب بیمار ہوتا ہوں، تو ہی شفا دیتا ہے) میں اسی کی تعلیم ہے۔ یہاں تک ثابت ہے کہ ایک صحابی نے بچھو کے کاٹنے پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دَم کر دیا، اور وہ اچھا ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کی نہ صرف تصویب کی، بلکہ ہدیہ میں اپنا حصہ لگانے کو بھی فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، .... اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخَوْفِ وَالْحُزْنِ .... جیسی دعائیں اسی کے لیے تعلیم کی گئی ہیں۔

اگر کسی علاقے میں سب ہی صاحبِ نصاب ہوں اور قربانی کریں تو گوشت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، کیا ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ چند لوگ قربانی کریں اور باقی افراد اس کی رقم کسی دینی، رفاہی یا جہادی فنڈ میں دیں۔

۲۔ اگر جہاد فنڈ میں قربانی کی کھال دینا جائز ہے تو پورے جانور کی رقم دینا کیوں جائز نہیں؟

۱۔ ہر واجب کی ادائیگی لازم ہے۔ جس پر قربانی واجب ہے اور وہ کر سکتا ہے، اس کو قربانی کرنا چاہیے۔ اصل مقصد حکمِ الٰہی کی تعمیل ہے، نہ کہ ہماری عقل کے مطابق گوشت کا مصرف۔ حج کے موقع پر قربانی لازم ہے، اور ظاہر ہے کہ وہاں بے پناہ گوشت ضائع ہوتا تھا، بلکہ ٹریکٹر ذبح کے بعد جانوروں کو مٹی میں دبا دیتے تھے۔ اب گوشت پیک کر کے دُور دراز مستحقین تک پہنچانے کا کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔ ہماری بستیوں میں ایسی صورت حال کہ گوشت ضائع ہو جائے، قرینِ قیاس نہیں۔ ہر بستی میں غربا کی کثرت ہے، دوسری بستیاں بھی قریب قریب ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرضی صورت حال ہے جو قربانی کی رقم رفاہی، دینی یا جہادی مقصد کے لیے دینے کا جواز تلاش کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے۔ اور

روزانہ نہ معلوم کتنے اخراجات ہوتے ہیں جو واقعی اسراف و تبذیر یا غیر لازمی اخراجات کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان سب سے رقم بچا کر ان مقاصد کے لیے کیوں نہ دی جائے، نہ کہ اللہ کے ایک حکم کو ترک کر کے دینے کا سوچا جائے۔

۲۔ ایک واجب دوسرے واجب کی جگہ نہیں لے سکتا، اِلّا یہ کہ ایک واجب کی ادائیگی سے دوسرا واجب ساقط ہوتا ہو۔ یہ افضلیت کا مسئلہ نہیں۔ اگر قربانی کرنے سے کوئی زیادہ بڑا فرض ساقط ہوتا ہو، تو آدمی قربانی چھوڑ کر وہ فرض ادا کرے گا۔ اگر اس طرح عمومی مقاصد کے لیے مخصوص واجبات ترک کیے جانے لگے تو کوئی واجب قائم نہ رہے گا۔ قربانی کی کھال سے پوری قربانی کا موازنہ صحیح نہیں ہے۔ قربانی کی کھال تو صدقہ ہے، اس کے دینے ہی کا حکم ہے۔ جبکہ قربانی کا گوشت آپ خود کھا سکتے ہیں، اقربا و احباب کو کھلا سکتے ہیں۔ ان کو آپ کھال نہیں دے سکتے۔ یہ قیاس مع الفارق ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

میں سید علی گیلانی کی کتاب رُوداد قفس کے نسخے چند اہم روابط کو دینا چاہتا ہوں، کیا زکوٰۃ یا صدقہ کی رقم اس میں خرچ کی جا سکتی ہے؟

میری رائے میں یہ خرچ فی سبیل اللہ کی تعریف میں آتا ہے، بلکہ اس کے نتیجے میں اگر جہاد کے لیے رقم وصول ہو تو اس میں سے بھی یہ اخراجات دیے جا سکتے ہیں۔

ایک ساتھی بنک کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انھیں رکن بنانا چاہا تو ساتھیوں نے توجہ دلائی کہ چونکہ وہ بنک سے پنشن لیتے ہیں، اس لیے انھیں رکن نہیں بنایا جا سکتا۔ جماعتی پالیسی سے آگاہ فرمایے۔

جہاں تک بنک سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن لینے کا تعلق ہے تو اس کا ایک پہلو فقہی ہے، جو آپ کسی معتمد علیہ مفتی سے پوچھ لیں، میرے علم کی حد تک ساری ہی پنشنوں میں بالعموم سود کا روپیہ غالب ہوتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بنک کا ملازم سودی کاروبار میں ملوث نہیں۔ یہی اس کا ذریعہ معاش ہے، اور اب وہ اسے ترک کر کے کوئی متبادل ذریعہ معاش اختیار نہیں کر سکتا۔ پھر فقر کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ میرے خیال میں جماعت کے کسی ادارہ نے ان جزئیات میں کوئی پالیسی نہیں بنائی ہے۔ میری رائے میں تمدنی بلوٰئے عام میں یہ اضطرار کی صورت ہے، اس کو رکنیت میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ آخر ہم کب تک ایک جاہلی نظام کے غلبہ کے تحت مجبور افراد کی قوتیں اس نظام کو بدلنے کے لیے، حاصل کرنے سے اجتناب کرتے رہیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آپ یہ کوشش کیوں نہیں کرتے کہ بزور شمشیر حکومت بڑے لوگوں سے چھین کر نیک لوگوں کے حوالے کر دیں۔ یا عوام کو ڈنڈے کے زور سے ٹھیک کر دیں۔

۱۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس آزمایش کے لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے صحیح راہ اختیار کرے۔ اس لیے ڈنڈے سے سمجھانے کا فلسفہ دین میں کوئی مقام نہیں رکھتا۔ ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہدایت خلق کے لیے انبیاو رُسل نہیں، جنرل اور فیلڈ مارشل مبعوث کرتا۔

۲۔ شمشیر کے ذریعہ انقلاب لانے کے لیے کچھ شرعی شرائط ہیں۔ جب تک وہ پوری نہ ہوں، اس کے استعمال کی گنجایش نہیں۔ مقصد ایک فاسد نظام کو نظامِ حق سے بدلنا ہے نہ کہ فساد میں اضافہ اور خون ریزی۔

شمشیر کون چلائے گا، اور چلانے والوں کا حامی و مددگار کون ہو گا؟ وہی عوام جو آپ کی رائے میں خود اپنی اصلاح کے لیے ڈنڈے کے محتاج ہیں؟

۱۔ جماعت اسلامی الیکشن میں حصہ لیتی ہے، اس طریقِ کار کے حق میں آپ کیا دلائل دیں گے۔ دوسرے طریقے جیسا کہ ڈاکٹر اسرار احمد پیش کرتے ہیں، ان پر آپ کا کیا تجزیہ ہے۔

۲۔ الیکشن پر لگنے والی رقم دعوتی کام اور لٹریچر کی تقسیم پر لگائی جائے تو کیا بہتر نہ ہو گا۔

۳۔ مولانا مودودیؒ نے کہا تھا کہ متناسب نظام جب تک نہ ہو گا، الیکشن سے فائدہ نہ ہو گا۔ کیا یہ نظام اب ہے جو جماعت الیکشن میں حصہ لیتی ہے۔

۴۔ جماعت کبھی سیکولر جماعتوں سے اتحاد کر لیتی ہے، اور کبھی نہیں کرتی۔ کبھی عورت (فاطمہ جناح) کا ساتھ دیتی ہے، کبھی اس کی حکمرانی کا عدم جواز پیش کرتی ہے۔ سیاسی روش میں یکسانیت نہیں پائی جاتی؟

۵۔ جماعت کا دعوتی پہلو کمزور محسوس ہوتا ہے، دعوت پہنچانے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔

۱۔ الیکشن میں حصہ لینا مستقل طریقِ کار نہیں، ایک تدبیر اور حکمتِ عملی ہے۔ طریقِ کار تو ایک ہی ہے، جس کی طرف قرآن مجید نے رہنمائی فرمائی ہے اور جسے انبیا کا طریقِ کار کہا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ انسانوں کو بدلا جائے۔ اور انسانوں کو مجتمع کر کے، ان کو قوت بنا کے، ان کے ذریعے زمامِ کار، نظام اور معاشرہ کو بدلا جائے، تاکہ اللہ کا کلمہ غالب ہو اور اس کا دین قائم ہو۔ دعوت و تبلیغ کے طریقے و تدابیر اور حکمتِ عملی کی صورتیں حالات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں، اور زمامِ کار اور نظام بدلنے کی تدابیر و حکمت عملی بھی۔ میرا خیال ہے کہ اس بنیاد پر سب کو اتفاق ہو گا، خواہ کوئی انتخابات میں

حصہ لینے کے حق میں ہو یا خلاف۔

زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے جو تدبیر اور حکمتِ عملی بھی اختیار کی جائے اس کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس کو منع نہ کیا ہو۔ دوسری یہ کہ اس سے حصولِ مقصد ممکن نظر آتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ ہی سے، جن کے ہاتھ میں زمامِ کار ہے وہ خود بدل جائیں۔۔۔ مثلاً، جیسا مدینہ کے انصار کے معاملہ میں ہوا، یا نبی کریمؐ کے خطوط کے نتیجے میں۔ ہو سکتا ہے کہ معاشرہ کی اتنی بڑی تعداد بدل جائے کہ زمامِ کار جن کے ہاتھ میں ہو، وہ انھیں چھوڑتے ہی بنے۔ ممکن ہے ان کے ساتھ پُرامن کشاکش ہو، مسلح جدوجہد ہو، باہر سے جنگ کی جائے، لوگ سڑکوں پر نکل آئیں۔ لوگ سول مزاحمت کریں، وہ ہتھیار سنبھال لیں، یا ممکن ہے وہ بیلٹ بکس میں ووٹ ڈال کر تبدیلی لے آئیں۔ بالآخر تدبیر اور حکمتِ عملی (Stretegy) کیا ہوگی، اس کا انحصار حالات پر ہے۔

اس لحاظ سے اگر آج کے معاشرہ میں انتخابات کے ذریعہ تبدیلی آیا کرتی ہو، تو اس تدبیر کو اختیار کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی قباحت نہیں، بلکہ اس پر کوئی اصولی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ بے شک انتخابات کے طریقے میں خرابیاں ہیں اور خرابیاں پیدا ہونے کا امکان ہے، لیکن ایسی خرابیاں اسی درجہ میں پُرامن مزاحمت یا مسلح جدوجہد میں بھی پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ خرابیاں تدابیر سے زیادہ انسانوں میں ہوتی ہیں۔ بادشاہ، جہاد فی سبیل اللہ کو لوٹ مار اور اپنی بادشاہی کے قیام کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے جہاد کا طریقہ غلط نہیں ہو جائے گا۔

جو لوگ انتخابات کو فی نفسہٖ غلط طریقہ قرار دے رہے ہیں، وہ اگر کبھی اس قابل ہو جائیں کہ معاشرہ ان کے ساتھ ہو اور وہ اس طریقہ سے پُرامن تبدیلی لا سکیں، تو کیا وہ اس طریقہ کو استعمال نہیں کریں گے؟ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ جب کوئی دعوت، پارٹی، یا شخصیت قبولیت عامہ حاصل کر لیتی ہے تو دھن، دولت، جاگیر داری سب دھرے رہ جاتے ہیں، اور عوام الناس اپنی پسند کے نابچرے منتخب کر لیتے ہیں۔ انتخابات میں فتح صرف دھن و دولت پر منحصر نہیں۔ آخر ایک سیٹ پر بے تحاشا دولت خرچ کرنے والے، جاگیردار اور سرمایہ دار ایک سے زیادہ ہوتے ہیں، اور ایک کے علاوہ سب ہارتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اپنی دعوت و تبلیغ سے قبولیت عامہ حاصل کرنے میں ناکامی کا الزام ہم انتخابات کے طریقۂ کار کے سر منڈھ کر خود کو بری الذمہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کچھ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا، والا معاملہ ہے۔ انتخاب ایک ذریعہ (tool) ہے، نااہل کاریگر اپنے اوزاروں ہی سے لڑتا رہتا ہے۔

۲۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے وسائل خرچ کرتے ہوئے ہم بہتر نتائج کا حصول پیشِ نظر رکھیں، اور

متبادل مصارف میں سے وہ مصرف اختیار کریں جس سے زیادہ نفع کی امید ہو۔ لیکن انتخاب بھی ایک دعوتی عمل ہے۔ اس قسم کے سماجی کاموں میں، وہ انتخاب ہو یا تقسیم لٹریچر، نفع کو ناپنا اتنا آسان نہیں کہ یہ کہہ دیا جائے کہ یہی وسائل اگر تقسیم لٹریچر پر لگا دیے جاتے تو زیادہ کارگر ہوتے۔ ہو سکتا ہے کہ لاکھوں روپے کا لٹریچر تقسیم ہو، اور کوئی قائل نہ ہو، ساڑھے نو سو سال دعوت کا کام ہو اور تھوڑے لوگ ایمان لائیں۔ اس میدان میں ناپنے تولنے کے پیمانے کچھ اور ہی ہیں۔

۳۔ پنچایتی نظام تو جماعت کا اپنا وضع کردہ طریق کار تھا، اپنے نمایندے منتخب کرنے کا۔ یہ الیکشن کے نظام کا حصہ نہ اس وقت تھا، نہ اب ہے۔ اس میں فوائد بھی ہیں، اور نقصان بھی۔ اب جماعت کا اپنا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے سارے کارکنوں سے رائے لیتی ہے (جو ایک محدود پیمانہ پر پنچایت ہی ہے) اور آخری فیصلہ مرکزی پارلیمانی بورڈ کرتا ہے۔

۴۔ آپ دو چیزوں کا فرق ملحوظ رکھیں تو آپ کی سمجھ میں یہ بات آسکے گی کہ جماعت کے مختلف اقدامات اور فیصلوں میں فرق کسی تضاد یا عدم یکسانیت کا نتیجہ نہیں۔ ایک ہیں اصول، مستقل طریق کار اور پالیسی، دوسرے ہیں انکے عملی انطباق کے لیے تدابیر اور صورتیں۔ دوسری چیز کا انحصار کلیتاً، حالات، اور مصالح پر ہو گا۔ کبھی صلح کی جاسکتی ہے کبھی جنگ، کبھی سزا دی جاسکتی ہے کبھی معافی، کبھی اتحاد ہو سکتا ہے کبھی صف آرائی۔۔۔ بدر کے میدان میں سردارانِ قریش کو تہ تیغ کیا گیا، اور خون ریزی کے بغیر قیدی بنانے کو بھی پسند نہیں کیا گیا۔ پھر صلح حدیبیہ ہوئی، فتح مکہ کے موقع پر عفوِ عام کا اعلان ہوا، اور برسوں کے جانی دشمنوں کو داد و دہش سے نوازا گیا۔ یہودیوں کو پہلے ایک ملّت کا حصہ بنایا گیا، پھر کسی کو جلا وطن کیا گیا اور کسی کو قتل، پھر خیبر میں ان کی کمر توڑ کر رکھ دی گئی، پھر ان کو جزیرہ العرب سے باہر نکال دیا گیا۔ سیاست اور جنگ میں یہ نہیں ہو سکتا، کہ جس سے دشمنی ہو اس سے ہمیشہ دشمنی رہے، جو ایک دفعہ حلیف بن جائے پھر وہ کبھی حریف نہ بنے۔ جماعت کے سارے فیصلے تدبیر و حکمتِ عملی کے دائرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بارہ میں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہ بحیثیت تدبیر صحیح نہ تھے، لیکن وہ کسی تناقض کا مظہر نہیں

۵۔ دعوت کا کام ایسا کام ہے جس کے بارہ میں کبھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس پیمانہ پر ہو رہا ہے کہ اس کا حق ادا ہو رہا ہے۔ اس لیے دعوت کے کام میں کوتاہی اور کمی کا احساس ہمیں روزِ اوّل سے رہا ہے۔ پھر ایک کوتاہی تو اس لحاظ سے ہوتی ہے کہ ہم آئیڈیل سے کتنے دُور ہیں۔ اس لحاظ سے ہم ہمیشہ ہی پیچھے رہیں گے۔ ایک کوتاہی اس لحاظ سے کہ عملاً جو کچھ کر سکتے ہیں وہ نہیں کر رہے۔ ہم خود اس لحاظ سے بھی ہمیشہ اپنی کوتاہی کے معترف رہے ہیں۔ لیکن آج کل، مجھے اس بات کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں،

کہ ہماری تعداد میں جتنا اضافہ ہو گیا ہے اس کے لحاظ سے ہمارا دعوت کا کام بہت کم اور کمزور ہے۔ اضافہ کے لیے جو تدابیر بس میں ہیں، وہ اختیار کر رہے ہیں۔ آپ تعاون بھی کریں، اور دعا بھی۔ جماعت کوئی مجرد وجود نہیں۔ ہمارا، آپ کا نام جماعت ہے۔ ہمارا آپ کا دعوتی کام مضبوط ہو گا تو جماعت کا دعوتی کام خود بخود مضبوط ہو ہو گا۔

نماز اور قربانی کی حوالے سے مولانا حمید الدین فراہی" کا مضمون (مئی ۹۴) پڑھ کر قربانی کے بارے میں چند سوالات ذہن میں ابھرے ہیں: مضمون میں کہا گیا ہے کہ "نماز میں زبان اور اداؤں کے ذریعہ سے ایمان کا اقرار کیا جاتا ہے۔ اور قربانی میں اسی ایمان کی تصدیق جان دے کر کی جاتی ہے"

۱۔ کیا ہم ابھی تک اقرار پر ہی گزارا کر رہے ہیں۔ جان کی قربانی کا وقت کب آئے گا، یعنی ہم اپنے ایمان کی تصدیق کب کریں گے؟

۲۔ کیا پاکستان کے مسلمانوں پر کشمیر کے مسئلے پر اب بھی جہاد (قتال) فرض نہیں ہوا؟ اسی طرح کشمیر، بوسنیا وغیرہ کے حوالے سے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے؟ براہ کرم رہنمائی فرمایئے کہ میں کیا کروں۔

۱۔ جان اسی وقت دی جائے گی جب جان طلب کی جائے۔ ہزارہا صحابہ کے لیے یہ موقع نہیں آیا، لیکن وہ اپنے ایمان میں صادق تھے۔ جب تک وہ موقع نہیں آتا، اس وقت تک ہر وقت جان دینے کے لیے آمادگی اور آرزو ضروری ہے۔ اس کی علامت قربانی ہے۔ پھر اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے تو ہزار بار اپنی خواہشات، پسند ناپسند اور مرغوبات کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ یہ بھی قربانی ہے، اور اپنے ایمان کی تصدیق کے زمرہ میں آتا ہے۔ یہ سوء فہم ہو گا اگر کوئی یہ سمجھے کہ ہر شخص جب تک جان نہیں دے گا اس کے ایمان کی تصدیق نہ ہو گی۔

۲ قتال کے لیے چند شرائط ہیں۔ جب وہ شرائط پوری ہو جائیں تو ہر شخص پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ پھر بھی سب میدان جنگ میں جا کر قتال نہیں کرتے۔ فی زمانہ تو اگر ایک آدمی میدان جنگ میں لڑتا ہے، تو اس کے پیچھے سو آدمی درکار ہوتے ہیں، جو اس کا لڑنا ممکن بناتے ہیں۔

اس وقت کشمیر اور بوسنیا سے باہر جو جماعتیں وہاں کے جہاد کے بارہ میں مخلص ہیں، ان کے لیے جہاد میں شرکت کا راستہ یہی ہے کہ وہ وہاں کے مجاہدین کو ہر طرح کی مادی، مالی، اخلاقی اور سیاسی مدد پہنچائیں۔ اور وہاں کے کمانڈر جس حد تک نفری کے طلب گار ہوں اس حد تک وہ بھی پہنچائیں۔

(خرم مراد)

کتاب نما

۔ پاکستان، نفاذِ اسلام اور اقبال: از مظفر حسین۔ ناشر: آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس، لاہور۔
صفحات: ۸۰۔ قیمت ۲۵ روپے

اسلام، حصولِ پاکستان کی جدوجہد کا ایک بڑا اور غالباً سب سے اہم حوالہ (اور جواز) تھا لیکن نصف صدی گزر جانے کے باوجود، یہاں نفاذِ اسلام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ کیوں؟ ہر مخلص اور دردمند پاکستانی مسلمان کی طرح جناب مظفر حسین بھی اسی الجھن سے دوچار ہیں، اور زیرِ نظر مقالے میں انھوں نے افکارِ اقبال کے حوالے سے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مقالہ نگار، موضوعِ زیرِ بحث پر، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ہم نوا ہیں، جو سمجھتے تھے کہ پاکستان میں جب بھی اسلام نافذ ہو گا، علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنا پر ہو گا۔ مگر المیہ تو یہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے اب تک عوام و خواص، حکمران و سیاست دان اور شعرا و دانش ور، سبھی علامہ اقبال کے مداح رہے ہیں (حتیٰ کہ بے نظیر بھٹو بھی "اقبال کے اسلام" کو تسلیم کرنے کا اعلان کر چکی ہیں) اس کے باوجود نفاذِ اسلام ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا، کیوں؟---- جناب مظفر حسین نے اس کی ذمہ داری علما پر عائد کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال بھی مُلّا سے کُلّی طور پر "مایوس، ناامید اور بے زار" تھے۔ فاضل مصنف نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اقبال کے "فلسفۂ خودی کے ہم نوا علما میں سرفہرست" شمار کرتے ہوئے اسے اسلامی دنیا کی بہت بڑی خوش قسمتی قرار دیا ہے کہ عالمِ اسلام کو "علامہ اقبال کی ہم نوائی میں مولانا مودودی جیسا صاحبِ قلم شارحِ اسلام میسر آیا۔" مگر انھیں مولانا مودودی کے ہاں کچھ ایسی خامیاں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں، جن کی بنا پر مولانا (اور ان کی جماعت) پاکستان میں نفاذِ اسلام کی ناکامی کے "بڑے مجرم" قرار پاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا نے "پاکستان کی کھلم کھلا مخالفت" کی، پھر اسلام کو ایک ایسی "نظریاتی تحریک کی حیثیت" دے دی، جس میں "سیاست کا رنگ بہت گہرا ہے۔" مزید برآں تصوف کے معاملے میں "سرد مہری" کا رویّہ اختیار کیا۔

مصنف کے خیال میں جماعتِ اسلامی کے علاوہ دیگر مذہبی جماعتوں نے بھی "جمہوری سیاسی راستے

کو اپنا کر" شدید غلطی کا ارتکاب کیا ہے چنانچہ نفاذِ اسلام کے سلسلے میں وہ دینی سیاسی جماعتوں سے مایوس ہیں، وہ مشورہ دیتے ہیں کہ : "انھیں مولانا امین احسن اصلاحی اور علامہ اقبال کی اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ الگ الگ (بلکہ متحارب) دینی سیاسی جماعتیں بنانے کے بجائے پوری ملت کو "الجماعۃ" قرار دیں، اور پوری ملت کو مقصود بنا کر ہر شخص، اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے آپ کو، جس خدمت کا اہل پائے، وہ خدمت انجام دے۔"

ان کا پیش کردہ ایک اہم (غالباً سب سے اہم) نکتہ یہ ہے کہ اسلام کا فروغ و نفاذ "ایک کلچرل تحریک" کے ذریعے ہونا چاہیے۔ ان کے خیال میں مولانا مودودی اور علامہ اقبال میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر کی "نظریہ پسندی کی شدت"، "تحریکی شدت پسندی، اور تعبیر اسلام میں سیاسی و نظریاتی کشمکش" کے عنصر کے مقابلے میں، علامہ اقبال کے ہاں، اسلام کی تہذیبی تحریک کا پہلو غالب ہے اور "نفاذ اسلام کے لیے کسی سیاسی تحریک کے مقابلے میں، علامہ اقبال کی زیادہ دلچسپی، نفوذِ اسلام کی کلچرل تحریک سے ہے"۔

بلاشبہ جناب مظفر حسین، اقبال کے متخصص (Specialist) ہیں مگر ہمارے خیال میں ان کی متذکرہ بالا رائے، علامہ کے تصوّرِ اسلام کی صحیح اور مکمل تعبیر پیش نہیں کرتی۔ یہ درست ہے کہ علامہ اقبال نے اسلام کے کلچرل پہلو کے بارے میں پسندیدگی ظاہر کی ہے، لیکن ان کی تعبیر اسلام کو محض "کلچرل تحریک" تک محدود کرنا، اقبال اور فکرِ اقبال سے انصاف نہ ہو گا۔ اقبال، حق و باطل کی کشمکش میں بھرپور طریقے سے حصہ لینے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کی تعمیری قوتوں کی تنظیم اور شیرازہ بندی کے لیے معرکہ آرائی کا مرحلہ ناگزیر ہے۔ "ستیزہ کاری" عیب نہیں، بلکہ زندگی کا ایک فطری عنصر ہے۔ وہ نوجوانوں کو "خارا شگافی" کے طریقے سکھانا چاہتے ہیں۔ انھیں تشویش ہے کہ ایک طرف تو : "تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم" مگر دوسری طرف : "کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام" کی افسوس ناک صورت حال نظر آتی ہے۔ اگر ہم اسلام کا نفاذ و نفوذ چاہتے ہیں تو پھر اسلام کے "سیاسی پروگرام" سے اجتناب کرنے یا "تحریکی شدت پسندی" سے الرجک ہونے کی ضرورت نہیں۔ اقبال کا شاہین اپنی راہبانہ فطرت کے باوجود "جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا" کے راستے پر گامزن ہے تاکہ لہو گرم رہے اور اسے وہ قوت و طاقت فراہم ہو، جسے اقبال "قوتِ شبیری" کا نام دیتے ہیں : "زندہ حق از قوتِ شبیری است" اور : "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری"۔

یہاں ایک لمحے کے لیے اس بحث سے قطع نظر کیجیے کہ اقبال کے تصوّرِ اسلام کے اہم اجزا کیا ہیں؟ وہ محض ایک "کلچرل تحریک" ہی سہی، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلچر کیسے نافذ ہو گا؟ قوم کے سامنے

"اسلامی نصب العین اور مقاصد واضح کرنے" اور اس کے اندر "توحید کی تعلیم عام کرنے" کا کام کون انجام دے گا؟ نصابی کتابوں میں عقیدۂ توحید سمونے کی کون اجازت دے گا؟ قوتِ نافذہ کیا ہوگی؟ تعجب ہے کہ قوتِ نافذہ کا مسئلہ مصنف کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔

پاکستان میں نفاذِ اسلام کے ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے (کوئی مورخ اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا) کہ نفاذِ اسلام کے سلسلے میں پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کا رول کیا رہا؟ مصنف نے لیگ کی میزانِ عمل سے چشم پوشی کی ہے، بلکہ بالواسطہ کئی جگہ اس کی مدح سرائی کی ہے، اور اسے تحفظ فراہم کیا ہے۔ (یہ مقالہ نومبر ۱۹۹۳ اور اس سے متصل ماقبل زمانے میں تحریر کیا گیا تھا۔ مصنف کو مسلم لیگ (ن) کی شکست سے جو شدید صدمہ پہنچا، مقالے پر اس کا واضح اثر موجود ہے۔)

یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ فاضل مصنف کا یہ کہنا درست نہیں کہ مولانا نے اقبال کے لیے "میرا روحانی سہارا" کے الفاظ استعمال کیے تھے (مظفر صاحب کے ہاں اس کا حوالہ بھی درست نہیں ہے)۔ مولانا نے اقبال کی وفات پر لکھا تھا: "سب سے بڑا مادی سہارا، جس سے مدد کی توقع تھی، اقبال کا سہارا تھا، سو وہ بھی یہاں قدم رکھتے ہی چھین لیا گیا" (ترجمان القرآن، شمارہ محرم ۱۳۵۷ھ)

جناب مظفر حسین کا زیر نظر مقالہ بلاشبہ ان کی وسیع مطالعے، دردمندانہ سوچ اور نفاذِ اسلام اور پاکستان کے مستقبل کے بارے میں ان کی فکرمندی کا مظہر ہے، مگر اس کے ساتھ بعض معاملات میں ان کے مغالطہ انگیزیوں، تضادات اور غلط اندیشیوں کا مرقع بھی ہے۔ آپ اسے پاکستانی دانشوری کا عبرت انگیز المیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اقبالیات، درسی کتب میں از شاہد اقبال کامران۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، مرکز ایف سیون، اسلام آباد۔ صفحات ۲۲۰۔ قیمت درج نہیں۔

زیر نظر کتاب ایک تحقیقی رپورٹ ہے، جسے ایم فل اقبالیات کی ڈگری کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی (خصوصاً سرکاری) اداروں میں مختلف سطحوں پر علامہ اقبال کی تحریریں کس حد تک نصابات میں شامل ہیں اور ان کا مطالعہ کس انداز میں اور کن زاویوں سے کیا جا رہا ہے۔ اس جائزے سے پتا چلتا ہے کہ اقبال کے حالات اور ان کی شاعری کی تعلیم و تدریس پہلی جماعت سے ایم فل اردو تک کے تعلیمی نصابات میں شامل ہے اور مختلف مضامین کی درسی کتابوں میں، اقبال کا تذکرہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کا سب سے زیادہ ذکر صوبہ بلوچستان کی نصابی کتابوں میں اور سب سے کم پنجاب کے نصابات میں ملتا ہے۔ بعض نصابی کتابوں میں متحدہ قومیت،

اسلامی قومیت، نظریۂ پاکستان یا تعلیم کے مباحث میں اقبال کا ذکر سرے سے موجود ہی نہیں یا اقبال کا نقطۂ نظر غیر موثر یا غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے بعض یونیورسٹیوں کے نصابات میں مطالعۂ اقبال سے بے نیازی کے رجحان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ درسیات پاکستان میں بہت سی خامیوں کا سبب، منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ ان کے بقول: "یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا کلام محض خیر و برکت کے لیے شامل کیا جا رہا ہے۔" دراصل بے ہنگم اور غیر مربوط انداز میں کام کرنے کے رجحان نے ہمارے ہاں ایک مستقل معاشرتی رویے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

شاہد اقبال کامران نے اس پھیلے ہوئے موضوع کو سمیٹنے میں خاص محنت کی ہے۔ ۲۳ نکات پر مشتمل ان کے "نتائج تحقیق" موضوع پر ایک مجموعی تبصرہ بھی ہے، اور تحقیق کار کے تاثرات اور تجاویز نامہ بھی۔ یہاں ہم مقالے کی دو تین کمیوں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ اول: ملتان، پشاور اور سندھ کی جامعات میں ایم اے کی سطح پر تدریس اقبالیات کی تفصیل مہیا نہیں کی گئی۔ دوم: یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہماری انگلش میڈیم درسگاہوں میں تدریس اقبال کی کیا صورت ہے۔ سوم: یہ تذکرہ مفقود ہے کہ تدریسی تربیت کے نصابات (سی ٹی، بی ایڈ اور ایم ایڈ وغیرہ) میں مطالعۂ اقبال کس حد تک اور کس انداز میں شامل ہے۔ امتحانی مقالہ تیار کرتے ہوئے تو (شاید وقت کی کمی کے باعث) یہ پہلو تشنۂ تحقیق رہ گئے، مگر اشاعت کے موقع پر یہ سروے مکمل کر لیا جاتا تو بہتر تھا۔ بہر حال اس کوتاہی کے باوجود اس مقالے کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ نصابات میں اقبالیات کی بہتر شمولیت اور تدریس کے لیے منصوبہ بندی اور حکمت عملی وضع کرنے کے سلسلے میں یہ رپورٹ ایک مفید بنیاد بن سکتی ہے۔

اقبال ریویو (مجلہ): مدیر، محمد ظہیر الدین احمد۔ ناشر: اقبال اکیڈمی، نارائن گوڑا حیدر آباد ۵۰۰۰۲۹۔ صفحات کی تعداد متعین نہیں۔ قیمت: ۳۰ روپے فی شمارہ۔

افکار اقبال کی ترویج و اشاعت کے لیے بھارت میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان میں حیدر آباد دکن کی اقبال اکیڈمی کا نام اس لیے نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ یہ اکیڈمی کسی طرح کی سرکاری سرپرستی یا مدد کے بغیر، حیدر آباد کے چند مخلص اقبال دوستوں کے ایثار و تعاون اور پرخلوص کاوشوں سے چل رہی ہے۔

فروغِ اقبالیات کے لیے اکیڈمی مختلف سمتوں میں مفید اور قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ (مثلاً: اشاعت کتب کے ساتھ ساتھ اقبالیات، بچوں اور نوجوانوں کے تحریری و تقریری اور کوئز مقابلے، اقبالیات پر ایک بڑے، (غالباً بھارت میں سب سے بڑے) ذخیرہ کتب و رسائل پر مشتمل ایک عمدہ کتب

خانے کے ذریعے مطالعہ و تحقیق کی حوصلہ افزائی، اقبال نمایشوں اور مقامی طور پر اقبال مذاکروں کا انعقاد، قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا اہتمام وغیرہ)

اکیڈیمی "اقبال ریویو" کے نام سے اردو اور انگریزی میں، ایک سہ ماہی علمی اور تنقیدی مجلہ بھی شائع کرتی ہے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے، یہ مجلہ کئی برس سے تعطل کا شکار تھا، اب اسے دوبارہ جاری کیا گیا ہے۔ دورِ نو میں مجلّے کے متعدد مفید شمارے سامنے آئے ہیں۔ نومبر ۱۹۹۳ میں اقبال کی معروف نظم "مسجد قرطبہ" پر گیارہ تنقیدی مقالوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اپریل ۱۹۹۴ کا شمارہ، جامعہ عثمانیہ کے علمی مجلّے میں شائع شدہ مضامینِ اقبالیات پر مشتمل ہے۔

"اقبال ریویو" کے مختلف شماروں سے بھارت میں اقبال شناسی کے معیار و منہاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی، مجلّے کے مقالہ نگاروں کے ہاں راست فکری اور افہام و تفہیم کا زاویہ نمایاں ہے اور یہ احساس بھی کہ عصری تناظر میں ان کے لیے، اقبال کے ہاں ایک معنویت موجود ہے۔ مقالات کا معیار اطمینان بخش ہے۔ اقبال پر پاکستانی مطبوعات بہت کم تعداد میں بھارت پہنچتی ہیں، اس اعتبار سے "اقبال ریویو" کی اشاعت، اقبالیات کے لیے فال نیک کی حیثیت رکھتی ہے۔

رواداری اور دینی غیرت : از ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری۔ ناشر: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، ننکانہ صاحب، ضلع شیخوپورہ۔ صفحات ۸۸۔ قیمت درج نہیں۔

ایک اہم انسانی قدر کے طور پر، رواداری کی صفت، اسلام کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ مسلمان حکومتوں نے غیر مسلموں سے ہمیشہ بہت فیاضانہ سلوک کیا۔ اسلامی تاریخ میں رواداری کی زریں مثالیں اور حقوقِ انسانی کی پاسداری کی عظیم الشان روایات ملتی ہیں۔ مصنف کو شکوہ ہے (اور ایک حد تک بجا ہے) کہ دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں کمی واقع ہو جانے کے نتیجے میں، رواداری کے مسئلے پر ہمارے ہاں توازن برقرار نہیں رہا۔ انھوں نے پاکستان کے ۵۶ء۱ فیصد عیسائیوں اور ۱۲ء فیصد قادیانیوں کے بارے میں، پاکستانی حکومت اور عوام کی فراخ دلی پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "کوئی نہیں جانتا کہ یہاں چیف جسٹس سے لے کر وزرا تک، سول حکمرانوں سے لے کر افواج پاکستان تک، تمام کلیدی عہدوں پر اقلیتیں ہمیشہ براجمان رہی ہیں۔ کسی شعبہ زندگی میں ان سے کوئی تعصب نہیں برتا گیا۔" مگر مذکورہ اقلیتوں کا رویہ حد درجہ افسوس ناک اور جارحانہ ہے۔ عیسائی "بلامبالغہ ہزاروں مسلمانوں کو عیسائی" بنا چکے ہیں، اور قادیانی اقلیت کا رویہ تو ان سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ بقول مؤلف: "پاکستان کی سب سے چھوٹی، مگر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سب سے زیادہ فعال اور خطرناک مشنری اقلیت" نے

"ہمیشہ ملک عزیز کے آئین اور قوانین کا نہ صرف مذاق اڑایا، بلکہ انھیں سرے سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ کے وقار کو بھی شدید مجروح کیا، مگر ہماری حکومت اور عوام کی فیاضی اور رواداری نے انھیں کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔" مصنف نے اس ضمن میں تفصیلی کوائف پیش کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اب یہ اقلیتیں، گستاخ رسول ﷺ کا قانون ختم کرانے کی فکر میں ہیں۔

مصنف نے زیر بحث موضوع پر ہر مکتب فکر کے علما و مصنفین کی آرا سے استشہاد کیا ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ اقتباسات پر مشتمل ہے۔ مصنف کی اپنی تحریر میں استدلال کم ہے، اور جذباتی قسم کی خطابت زیادہ، حالانکہ زیر بحث موضوع غیر جذباتی اور سنجیدہ لب و لہجے کا متقاضی تھا۔ (رفیع الدین ہاشمی)

انیسویں صدی کی چند نامور مسلم شخصیات۔ از: ڈاکٹر احمد امین مصری۔ مترجم: شیخ نذیر حسین۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور ۱۸۔ صفحات ۲۹۴۔ قیمت درج نہیں۔

ڈاکٹر احمد امین مصری کی خود نوشت سوانح "حیاتی"، "سرگذشت حیات" کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو کر قارئین کے لیے سامانِ بصیرت فراہم کر چکی ہے۔ "حیاتی" کا اردو ترجمہ شیخ نذیر حسین صاحب نے کیا تھا۔ اب انھوں نے ڈاکٹر احمد امین کی ایک اور اہم کتاب "زعماء الاصلاح فی مصر الحدیث" کا اردو ترجمہ "انیسویں صدی کی چند نامور مسلم شخصیات" کے عنوان سے پیش کیا ہے، جس میں مصنف نے اطرافِ عالم اسلام سے شیخ محمد بن عبدالوہاب، مدحت پاشا، سید جمال الدین افغانی، سر سید احمد خان، سید امیر علی، خیر الدین پاشا تونسی، علی مبارک پاشا، عبداللہ ندیم، سید عبدالرحمٰن الکواکبی اور شیخ محمد عبدہ کا انتخاب کیا ہے۔

مختلف شخصیات کے تذکرے میں مختصراً ان کے سوانح، افکار اور خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، جس کے ساتھ ساتھ مصنف کی تنقیدی آرا بھی واضح ہوتی جاتی ہیں۔ سوانح، افکار اور خدمات کے بیان میں کسی حد بندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ مصنف کی معلومات اور ان کے تنقیدی خیالات، ہر شخصیت کے ذکر میں، اس ضمن میں تغیر کو روا رکھے ہوئے ہیں۔ مصنف کی بعض آرا کی صراحت اور بعض سے اختلاف کے لیے، مترجم نے ہر باب کے آخر میں کچھ مختصر حواشی ایزاد کر دیے ہیں جن سے مترجم کی آرا بھی معلوم ہوتی جاتی ہیں۔ غیر مصری شخصیات کے بارے میں ڈاکٹر احمد امین کی معلومات حیران کن حد تک وسیع ہیں تاہم جغرافیائی دوری کے باعث، قدرتی طور پر ان کے تذکرے میں کچھ محل نظر امور بھی راہ پا گئے ہیں جنھیں نظر انداز بھی کیا جا سکتا۔ جہاں تک خاص جغرافیائی مباحث کے علاوہ قوموں کی اجتماعی تقدیر

سے وابستہ افکار کا تعلق ہے، مصنف نے بہت خوبی سے اپنی ممدوح شخصیت کے ہاں ان کا کھوج لگایا ہے، مثلاً: سرسید احمد خان کے ذکر میں مصنف نے ان کا یہ قول باہتمام نقل کیا ہے: "مغرب کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں نے علوم و فنون اپنی زبان میں حاصل کیے ہیں؛ اگر انگلستان کا ذریعہ تعلیم لاطینی یا یونانی یا عربی یا فارسی زبان ہوتا، تو اہل انگلستان بھی ہندستانیوں کی طرح جاہل رہ جاتے۔"

کتاب کے آغاز میں مصنف کا جو مختصر مقدمہ درج ہے، وہ عالم اسلام کی فکری بلندی و پستی کا ایک مختصر اور جامع جائزہ پیش کرتا ہے، جس پر مترجم اور ناشر کی تحریروں نے اضافہ کر دیا ہے۔

شخصیات کے مفصل تذکروں کے علی الرغم، بعض مقامات پر تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے، مثلاً: سید جمال الدین افغانی کے باب میں مصنف نے اخیر عمر میں ماسونیوں سے ان کے انسلاک کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے عواقب و نتائج پر کھل کر بات نہیں کی۔ کیا اچھا ہوتا اگر مصنف محترم اس حیران کن پہلو پر تفصیل سے کلام کرتے؛ تاہم مجموعی طور پر کتاب متوازن اور معلومات افزا ہے۔ (زاہد منیر عامر)

اسلام اور معاشی ترقی: از پروفیسر خواجہ نسیم شاہد۔ ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق، مزنگ لاہور۔ صفحات ۱۲۰۔ قیمت ۳۹ روپے۔

معاشی ترقی ایک اندھی قوت ہے۔ اس کا انتہائی پیچیدہ اور ہمہ گیر عمل صرف معاشی ڈھانچے کو ہی متاثر نہیں کرتا بلکہ اعتقادی اور اخلاقی ڈھانچوں کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اسے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ معاشی ترقی کے عمل کو سمجھا جائے اور ترقیاتی حکمتِ عملی کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ سات مقالات کے اس مجموعے میں نسیم شاہد نے اسی (متذکرہ بالا) امر کی کوشش کی ہے اور بہت خوب کوشش کی ہے، ذہن صاف کیے ہیں اور لائحہ عمل کو واضح کیا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کے دیباچے میں اسلامی معاشیات کے حوالے سے مفید معلومات (اسلامی معاشیات پر ۴ کتابیات، ۲۰ سے زائد جامعات میں اسلامی معاشیات کی بطور مضمون تدریس، ۱۲ غیر سودی بین الاقوامی بنک) بھی ہیں اور کتاب کی قدر و قیمت پر ان کی رائے کا اظہار بھی۔ سلیس زبان میں ہر تعلیم یافتہ شخص کے عام مطالعے کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ اسے انٹر اور بی اے کے معاشیات کے طلبہ کے "لازمی مطالعے" میں شامل ہونا چاہیے۔ ہماری رائے میں اس نوعیت کی کتاب، بہتر معیار طباعت پر ۲۵ روپے میں فراہم ہونی چاہیے۔ نشر و اشاعت کے جدید طریقوں کو کام میں لاتے ہوئے ایک دو سال کے اندر ایسی کتاب کے ۵،۵ ہزار کے دو تین ایڈیشن نکالنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ہمارے ناشرین کو اشاعتِ کتب کے اس پہلو پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ (مسلم سجاد)

محمد ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں : از آصف حسن۔ ناشر: شمع بک ایجنسی، نیو اردو بازار کراچی۔ صفحات ۶۴۔ قیمت ۹ روپے۔

اس مختصر کتابچے میں متعلقہ موضوع پر متعدد اقتباسات فراہم کیے گئے ہیں۔ ایسی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ غیر مسلم عموماً رسول کریم ﷺ کو، اللہ کا رسول تسلیم نہیں کرتے، یعنی ان کے نزدیک آپ کا دعویٰ نبوت جھوٹا تھا۔ اس لیے ان کے تعریفی کلمات میں بھی زہر گھلا ہوتا ہے اور یہ زہر فشانی بڑی چابک دستی سے کی جاتی ہے۔

صلوٰۃ النبیؐ : از مولانا محمد یوسف قریشی۔ ناشر: موتمر المولفین جامعہ اشرفیہ، چارسدہ روڈ، پشاور۔ صفحات ۹۶۔ قیمت ۱۰ روپے۔

۶۳ احادیث کی روشنی میں ترتیب کے ساتھ نماز سے متعلق ضروری امور بیان کیے گئے ہیں۔ "فاضربوہ" کا ترجمہ "مار مار کر پڑھاؤ" محلِ نظر ہے۔

قافلۂ حق : از ابن عبدالشکور۔ ناشر: دعوتِ اسلام سنٹر، بنگلور، بھارت۔ صفحات ۳۲۔ قیمت ۴ روپے۔

تجدید و احیائے دین کے لیے تحریکِ مجاہدین اور جماعتِ اسلامی کی خدمات کا مختصر تذکرہ۔

وضاحت

۱۔ ترجمان القرآن میں ترجیحاً دینی اور علمی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

۳۔ تبصرے کے لیے مطبوعات براہ راست: مدیر ترجمان القرآن منصورہ، لاہور ۵۴۵۷۰ کو بھیجی جائیں۔

مدیر کے نام

پرویز صدیقی، کراچی

جس قیادت نے آزادی کے بعد، آزادی کے شایان شان معمولی فیصلے بھی نہ کیے، اس سے یہ توقع کہ زبان جیسا بڑا فیصلہ کرتی، سادہ لوحی ہے۔ قیادت میں بنیادی تبدیلی کے بغیر، انگریزی کی غلامی سے نجات ممکن نہیں۔ (تعلیمی پالیسی، اکتوبر ۱۹۹۴)

رافع سمنان، ڈھاکہ

زبان کا مسئلہ نو آزاد لیکن تہذیبی غلام ممالک کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ زبان آقاؤں کا موثر ہتھیار ہے۔ ثقافتی استعمار نے میڈیا کے بھرپور استعمال سے، اس کی کاٹ میں خوب ہی اضافہ کر دیا ہے۔

محمد حسن، کراچی

میں ایک انگریزی میڈیم اسکول کھولنے کا ارادہ کر رہا تھا اب سوچتا ہوں کہ یہ کام نہ کروں۔

محمد امین، سمندری

انگریزی زبان پر سب اعتراض بجا، لیکن سب انگریز مسلمان ہو جائیں، تو انگریزی کی قباحت ختم ہو جائے گی یا ہمیں پھر بھی پرہیز کرنا ہو گا۔ مسلمان ہونے والے انگریز، انگریزی کا کیا کریں۔

عبدالعزیز، پشاور

اسلام اور مغرب کے مسئلہ پر مغربی اہل قلم زندہ قوموں کی طرح خوب سوچ رہے ہیں۔ (اسلام اور جمہوریت اکتوبر ۹۴) مسلمانوں کی نئی نسل میدان جہاد میں اپنے خون سے مستقبل کی تاریخ کے نشان ڈال رہی ہے۔ لیکن آنکھیں کسی مسلمان اہل قلم کی ایسی پایہ کی تحریر کے لیے ترستی ہیں جس میں ماضی و حال پر نظر ڈال کر، مستقبل کی پیش بینی کی گئی ہو۔ ایسی تحریر جو علمی، و سیاسی حلقوں میں موضوع بنے اور راہنمائی کرے۔

وقار احمد، ملتان

مغرب میں اسلام پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بہت سے بہت یہی ہے کہ مغرب

کے بارے میں، خود مغرب میں جو کچھ لکھا جاتا ہے، اس کی جھلکیاں پیش کر دیں۔ مغرب کے براہِ راست مطالعہ کا بھی کوئی نظام ہونا چاہیے، اگر اس پر غلبہ پاکر ۲۱ ویں صدی کو، اسلام کی صدی بننا ہے تو۔

ابو اکرام، دوحہ۔ قطر

سالگرہ کی تقریب (ستمبر ۹۴) مغرب و نصاریٰ کی تہذیب کی نمایندہ ہے۔ اس کا اسلامی تہذیب سے کیا تعلق؟

ریاض احمد خٹک، نیویارک

وقت کی قدر کیجیے (جولائی ۹۴) بہت مفید تھا۔ اس نوعیت کے مضامین کو مستقل جگہ دیں۔

سید لطف اللہ، کراچی

اکتوبر کے شمارے میں سب مضامین ایک سے ایک اچھے لگے۔ خوب لطف آیا۔ اللہ آپ کو خدمت دین کی مزید توفیق دے۔ آمین

مظفر حسین غزالی، نئی دہلی

شمارہ موصول ہوا۔ اول تا آخر پڑھا۔ اسے پڑھ کر مولانا مودودیؒ کی یاد تازہ ہو گئی۔ آپ کی اس نوازش کا شکریہ۔ "عصر جدید اور تعلیم" ارسال کروں گا۔

غازی الدین احمد، کراچی

ترجمان کے اجرا سے جماعت اسلامی کی تاسیس تک کے دَور کے اشارات کے اقتباسات سے آپ نے اشارات (ستمبر ۹۴) کو دوبارہ مزین کیا اور داعی کی تحریروں سے آج ہمیں دعوت پیش کرنے میں، موقع کی مناسبت سے نہایت اہم مواد فراہم کیا۔ اس ترتیب اور پیشکش پر، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

اللہ داد نظامی، وہاڑی

سرورق پر امت اور انسانیت کا راہنما، نمایاں طور پر درج کیجیے۔ اسلامی تحریکوں کے قائم کردہ مختلف اداروں کا تعارف بھی شائع ہونا چاہیے۔ اس طرح کام کے نئے راستے سامنے آتے ہیں۔ دسمبر میں ۱۹۹۴ کا اشاریہ ضرور آنا چاہیے۔ دسمبر میں نئے خریداروں اور ایجنسیوں کی تعداد میں توسیع کی مہم چلائیں۔ اشتہارات میں اضافہ کرکے، صفحات ۱۰۰ کر دیں تو بڑی خوشی ہوگی۔

قارئین کے نام

محترم / محترمہ .... السلام علیکم و رحمہ اللہ

میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں، اور یہ سرا سر اس کا فضل ہی ہے، کہ جب جنوری ۱۹۹۳ میں ترجمان کو تزئین نو کے بعد شائع کیا گیا تو اس کی اشاعت تین ماہ میں ہی تین گنا سے زیادہ بڑھ گئی - میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار بنے، بلکہ بھاگ دوڑ کر کے بے شمار نئے خریدار بنائے - اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے -

مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ مختلف وجوہات کی بنا پر کئی خریداروں کو چندہ ادا کرنے کے بعد بھی پرچہ نہ ملا - یا ایک عرصہ ملنے کے بعد جون / جولائی سے ملنا بند ہو گیا - چیکنگ سے معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے خریداروں کی رقوم موصول ہوئیں مگر ان کے کارڈ نہ بنائے گئے یا ان کے پتے نامکمل درج کیے گئے - یا ان کا اندراج ہی نہ ہوا اسی طرح سینکڑوں کارڈ اور پتے مئی/جون کے مہینہ میں ریکارڈ سے غائب کر دیے گئے -

ہم نے جہاں تک بس میں تھا ریکارڈ درست کیا ہے - لیکن اب میں آپ کے تعاون کا شدید محتاج ہوں اس لیے کہ جن کا ریکارڈ بالکل ہی غائب کر دیا گیا یا اندراج نہیں ہوا یا پتے نامکمل ہیں، ان تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہیں - اس طرح ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کس خریدار کو کون سے پرچے نہیں ملے - ذیل میں ایک کوپن منسلک ہے - اگر آپ کو کوئی شکایت ہے، یا آپ کے علم میں کسی اور کی شکایت ہے یا جن کو آپ نے خریدار بنایا ہے، ان تک آپ پہنچ سکتے ہیں اور ان کو شکایت ہے، تو براہ کرم اس کوپن کو پر کر کے ہمیں فوراً ارسال کر دیں - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو گزشتہ پرچے بھی ارسال کیے جائیں گے - آئندہ بھی شکایت نہ ہوگی الا یہ کہ پرچہ ڈاک میں غائب ہو جائے -

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے - والسلام -

آپ کا
(خرم مراد)

---

1. نام اور پتہ (مکمل اور بہت صاف لکھیں)

----

2. آپ کس ماہ سے خریدار بنے --- چندہ کس طرح ادا کیا نقد / منی آرڈر / (رسید ہو تو منسلک کر دیں)

3. - کس کس ماہ کے پرچے نہیں ملے - 4. کیا آپ کو ایک سے زیادہ پرچے آ رہے ہیں؟

5. - اگر آپ کے علم میں کسی کی شکایت ہو تو اس کوپن کی فوٹو کاپی انھیں دے دیں۔

پتا: منیجر، ماہنامہ ترجمان القرآن - ۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور
ٹیلیفون نمبر : برائے سرکولیشن: 7587916 — استفسارات کے لیے: 7585590

شاداب کالونی
فیروزپور روڈ لاہور

منظرِ کوہسار
اسلام آباد

گلشن احباب
فیز II نزد فیروزپور روڈ لاہور

گلشن احباب
فیز I ملتان روڈ لاہور

احباب پارک
ملتان روڈ لاہور

پانچ رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ



اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے
حسین دامن میں ایک نیا دلپذیر شہر

منظرِ کوہسار

ترقیاتی کام جاری ہیں

ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور
ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں
سیوریج، بجلی، پانی، سکول، کمیونٹی سنٹر، قبرستان
مسجد اور ہسپتال، خوبصورت جھیل

۳۱ جولائی تک رعایتی قیمت پر
سولہ ہزار روپے فی مرلہ بمعہ ترقیاتی اخراجات
باقی رقم تین سال کی قسطوں میں،
تین ہزار روپے فی مرلہ کا ڈرافٹ بھیج کر
بکنگ کرالیں پلاٹ ۲ کنال ۱۰ مرلہ
۵ مرلہ۔ کنال = ۶۰۰ مربع گز
خصوصی رعایت سے فائدہ اُٹھائیں۔

فیروزپور روڈ پر چونگی امرسدھو سے ۲ کلومیٹر

ایل ڈی اے سے منظور شدہ

شاداب کالونی

کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد، ڈسپنسری،
سکول، مارکیٹیں، ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولت
موجود۔ سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر
ترقیاتی کام جاری ہیں۔ کنال = ۵۰۰ مربع گز

قیمت ۲۰ ہزار روپے فی مرلہ بمعہ ترقیاتی اخراجات
ایک ہزار روپے فی مرلہ کی رعایت
۳۱ جولائی تک بڑھا دی گئی ہے۔
۳ ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے بکنگ کرائیں
باقی رقم تین سال کی آسان قسطوں میں
مفلٹ مفت منگوائیے۔

گلشن احباب فیز II نزد فیروزپور روڈ میں کنال پلاٹوں کی بکنگ جاری ہے

شاداب کالونی فیروزپور روڈ میں مارکیٹ کمرشل پلاٹوں کی بکنگ جاری ہے

تحریکِ اسلامی سے
وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ

شریف چیمبر 68 مزنگ روڈ لاہور فون 6361501-6366005-304754 فیکس 6369520

REGD. NO. L 5340

Back

PHONE : 7234014
7236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE